القاءِ الہام اور وحی

تالیف

مولانا ذوقی شاہ صاحب
(حیدرآباد دکن)

اقبال اکیڈمی
۵۴- سرکلر روڈ- بیرون موچی گیٹ- لاہور

قیمت بے جلد عہ

محصول ڈاک ۳ر

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

اقبال پر ایک نظر۔ چند بلند پایہ تنقیدی اور تشریحی مضامین کا مجموعہ۔ عہ

شرح اسرارِ خودی۔ پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے۔ عہ

تعلیماتِ اقبال۔ 〃 〃 〃 ۔ عہ

اقبال اور پیامِ حریت۔ 〃 〃 〃 ۔ عہ

اقبال کا تصورِ زمان و مکان۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی۔ ۱۰ر

موت و حیات اقبال کے کلام میں۔ 〃 〃 〃 ۔ ۱۴ر

تعلیم کا مسئلہ۔ 〃 〃 〃 ۔ عہ

اقبال کے چند جواہر ریزے۔ پروفیسر خواجہ عبدالحمید ایم اے۔ ۱۰ر

یادِ اقبال۔ مرتبہ چودھری غلام سرور فگار۔ عہ

حقیقتِ نفاق۔ مرتبہ مولانا صدرالدین اصلاحی۔ عہ

افاداتِ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ 〃 〃 〃 ۔ عہ

اسلام اور وطنیت۔ 〃 〃 〃 ۔ عہ

معرکۂ اسلام و جاہلیت۔ 〃 〃 〃 ۔ عہ

محمد عبدہٗ۔ مفتی محمد عبدہٗ مصری کے سبق آموز حالات۔ عہ

القاءِ الہام اور وحی

تصنیف

مولانا ذوقی شاہ صاحب

اقبال اکیڈمی

۵۴ (الف) سرکلر روڈ۔ بیرون موچی دروازہ لاہور

قیمت عہ

مقدّمہ

مضامین کا جو مجموعہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ اگرچہ عنوانات کے لحاظ سے متعدد مضامین پر مشتمل ہے، لیکن حقیقت میں یہ سب ایک دوسرے سے مربوط و وابستہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اسلام کی وہ حقیقی روح آپ کے سامنے آجائیگی جو بدنصیبی سے مغرب کی نام نہاد مادی ترقیوں کی بنا پر خود مسلمانوں کی نظر سے بھی اوجھل ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ان مضامین کے مصنف، ملک کے ایک ممتاز و قابل قدر عالم صوفی منش حضرت ذوقی شاہ صاحب ہیں آپ چونکہ علوم عربیہ کے علاوہ انگریزی سے بھی کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں، اس لئے اُس زہر کی بہترین تحلیل کر سکتے ہیں جو یورپ کے مستشرقین کی طرف سے اسلام کے چشمۂ صافی میں شامل کیا جارہا ہے اور جسے عام مسلمانوں کی نگاہیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔

اس سلسلۂ مضامین کے پہلے دو ابواب میں اُس بنیادی عقیدے کو عالمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جو اسلام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ "ظل و نور" کے عنوان سے آپ نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں خالق کائنات کا تعلق کائنات سے کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مضمون میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ خالق کائنات کن کن واسطوں سے افراد کائنات سے رابطہ پیدا کرتا ہے۔ وحی، الہام اور ارتقاء کے نام سے اسلامی دنیا میں جو اصطلاحیں بولی جاتی ہیں، اُن کی محققانہ تشریح اس مقالے میں کی گئی ہے جس کے پڑھنے سے آنکھوں کے سامنے خدا کی عظمت و

کبریائی کا وہ صحیح نقشہ آجاتا ہے جو اسلامی عقاید کی بنیاد ہے اور جس پر صحیح معنی میں ایمان رکھنا، انسان کو ملکوتی بلندیوں تک پہنچا سکتا ہے۔

اس کے بعد آسٹریا کے ایک مشہور نو مسلم جرمن بیرن عمر رالف نے اسلام و اسلامیات کے متعلق جن خیالات و جذبات کا اظہار کیا ہے اُنہیں تنقیدِ صحیحہ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازاں انگلستان کے پروفیسر نکلسن کے اُن خیالات کا جائزہ اسلامی روشنی میں لیا گیا ہے جو موصوف نے اسلامی تصوّف کے سلسلے میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ذوقی صاحب چونکہ مستشرقین یورپ کے معیارِ علم اور معیارِ فکر دونوں سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے انہوں نے بیرن عمر رالف اور پروفیسر نکلسن کے افکار و خیالات پر جو تبصرہ کیا ہے وہ دراصل یورپ کے تمام مستشرقین کی صحیح حیثیت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

اگرچہ اصول تو یہی ہے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی لیکن دُنیا کی بدنصیبی ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ عام لوگوں کی ظاہر بیں آنکھیں ہمیشہ ہر چمکنے والی چیز ہی کو سونا سمجھنے لگتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یورپ کی ظاہری چمک دمک سے ہمارے اہلِ علم تک کی آنکھیں اتنی خیرہ ہو چکی ہیں کہ وہ مستشرقین یورپ کے نام سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے قلم سے جو کچھ نکل جاتا ہے اُس پر کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ لیکن ذوقی صاحب کے مضامین کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نام نہاد فاضلانِ اسلام صرف تعصب و تنگ نظری ہی کا شکار نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی ان کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کی تشریح یورپ کے مروّجہ حال نظریات کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں جس کے نتیجے میں قدرتاً قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

آج کل عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ رواداری و عالی ظرفی کے لحاظ سے یورپ کے مصنفین بہت بلند ہیں اور اس کے ثبوت میں اُن خیالات و افکار کو پیش کیا جاتا ہے جو غیر مسیحی مذاہب کے متعلق یہ لوگ پیش

کرتے ہیں لیکن حقیقت شناس نگاہیں جانتی ہیں کہ یہ چیز صرف فریب نظر سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اصل یہ ہے کہ آج مذہبی لحاظ سے اہل یورپ کو مسیحی کہنا ہی سرے سے غلط ہے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام وہ ضرور لیتے ہیں اور انجیل کو کتاب مقدس بھی مانتے ہیں لیکن دنیا جانتی ہے کہ یہ چیز محض ایک ظاہری رسم سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ورنہ حقیقت میں مسیحی تعلیمات کا کوئی ادنیٰ سا اثر بھی ان کی زندگی کے کسی شعبے پر نہیں ہے اصلاح مذہب کی لوتھری تحریک کے بعد سے انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب نے یورپ کی سیاست و معیشت اور معاشرت و تمدن کو جس نئے سانچے میں ڈھال دیا ہے اُسکے بعد اُسے مسیحی سمجھنا خود کو ایک بہت بڑے فریب میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ اب تو یورپ کا مذہب دراصل چند افکار پریشاں کے سوا اور کچھ نہیں البتہ ان افکار پریشاں کی بنیادیں اس مادی ماحول کی نظر فریب ترقیوں پر رکھی گئی ہیں جن کا مظاہرہ یورپ کے چپے چپے پر نظر آتا ہے اس لئے کسی مذہبی معاملے میں اگر یورپ کے کسی آدمی کو غیر مسیحی انداز بیان اختیار کرتا دیکھیں تو اس کا مطلب رواداری و روشن خیالی ہرگز نہیں ہے علیٰ ہذا القیاس اگر اسلام یا کسی دوسرے مذہب کے کسی شعبے کے متعلق اُس کے قلم سے کوئی اچھی رائے آپ کو نظر پڑ جائے تو اس کا بھی کوئی تعلق فراخدلی و وسیع القلبی سے نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہی اُس پریشانی افکار کا جس کے سامنے حقیقت کا جلوہ مربوط و منظم شکل میں ہے ہی نہیں اس لئے کبھی تو یہ کسی چیز کی حمایت کر دیتے ہیں اور کبھی مخالفت، البتہ بنیاد ان افکار کی مادیت ہی پر قائم ہوتی ہے اسی بنیاد پر ذوقی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے کہ اگرچہ ظاہر میں آجکل کے مستشرقین یورپ میں اور عہد جاہلیت کے کفر پسند عربوں میں بہت بڑا فرق نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں کے خیالات آج بھی ایک ہی اثر سے متاثر ہیں۔ فرق صرف الفاظ کا ہے۔ وہ لوگ جس چیز کو سحر یا جادو کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے، اُسی کو آج کل ہپناٹزم یا سمرزیم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

غرض یہ مضامین دراصل ایسے مستقل خیالات و افکار کا مجموعہ ہیں جو آپ کے سامنے نہ صرف اسلام کو صحیح رنگ میں پیش کرتے ہیں بلکہ اسلام کے اُن مدعیان دوستی افراد کو بھی بے نقاب کرتے ہیں جو اسلام کو غیر اسلامی رنگ میں پیش کر کے اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

ظلّ و نور

انسان جب اپنے اصلی رنگ میں ہوتا ہے تو اپنی ہی بولی بولتا ہے، ہر فن میں کلام کرنے والا جب اپنے فن میں کلام کرتا ہے تو اسی زبان میں مقید رہتا ہے جو اس فن کے لئے مختص ہے۔ ایک معمولی شخص معمولی طور پر یہی کہیگا کہ "زید کو اس وقت تیز بخار ہے" مگر ایک ڈاکٹر جب اپنی زبان میں بات کریگا تو یوں کہیگا کہ زید کا ٹمپریچر اس وقت ایک سو پانچ ہے۔ الفاظ بظاہر مختلف مگر بباطن ہم معنی ہیں اگر فرق ہے تو بس اسی قدر کہ پہلے فقرہ میں اجمال ہے اور دوسرے میں کسی قدر تفصیل۔

ایک دوست کے اصرار پر میں بھی اس وقت "ظل و نور" کے متعلق صوفیانہ رنگ میں مختصراً کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تصوف کے مضامین کا حق تصوف ہی کی زبان کچھ ادا کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ناظرین میرے اس مضمون کو چیستان سے زیادہ وقعت نہ دیں لیکن غور و خوض کرنے والی طبیعتیں یقیناً اس سے محظوظ ہوں گی اور پانے والی بات کو پالیں گی۔

ظہور کائنات سے قبل ایک زمانہ تھا جس پر نہ زمانہ کا اطلاق ہوتا تھا نہ وقت کا۔ اس وقت نہ زمان تھا نہ مکان۔ نہ ازل نہ ابد۔ نہ تحت نہ فوق نہ ارکان تھے نہ عناصر۔ صرف ذات مطلق تھی اور کچھ نہ تھا۔ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَہٗ شَیْئًا۔

تخلیق کائنات کی جب پو پھٹی، ظہور کائنات کا جب آفتاب طلوع ہوا، تو جملہ اشیاء عدم سے وجود میں آئیں۔ اشیاء کو ظلمتِ عدمی سے نور وجود کی جانب لانے کا ہی نام تخلیق ہے۔ صوفیا کرام کی اصطلاح میں جملہ ظہورات و تعینات کو، وجود اضافی کو جو اعیان ممکنات تعینات کے ساتھ ظاہر

ہوتا ہے معدومات ظاہرہ کو جو انوار الٰہی کی چمک سے ظہور پکڑتے ہیں، ظِل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور نور وہ روشنی وہ چمک وہ قوت، وہ قدرت ہے جس سے یہ معدومات وجود میں آکر ظاہر ہوتے ہیں۔ نور ایک اسم ہے اسماء الٰہی میں سے جو تقریباً مترادف ہے اسم الظاہر کے احکام ممکنات جو دراصل معدومات سے ہیں اسم نور سے ظاہر ہوئے۔ اس ظہور کو وجود اضافی اور وجود خارجی کہتے ہیں۔ یہ اضافی یا خارجی وجود معدومات میں ظلمتِ عدمی ہے۔ وہ نور جو صور معدومات میں ظاہر ہوا ظل ہے۔ کیونکہ موہوم ہے اور منقول ہے اور فی نفسہا معدومات کی عدمیت ہے۔ تو گویا جن معدومات کا ظہور ہوا وہ بھی ظل ہیں اور جس نور کے سبب ان کا ظہور ہوا وہ نور بھی ظِل ہے۔

عالم کو حق تعالےٰ سے وہی نسبت ہے جو سایہ کو اس شخص سے ہے جس کا کہ وہ سایہ ہے۔ عالم جن پر کہ غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے اللہ تعالےٰ کا ظل ہے یہ ظل الٰہی جیسے کہ عالم کہتے ہیں اعیان ممکنات میں ظاہر اور ممتد ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ سورہ فرقان میں فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ کیا تو نے اپنے رب کی طرف نظر نہیں کی کہ اس نے وجود اضافی کو ممکنات پر کس طرح پھیلایا؟ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا اور اگر وہ چاہے تو اس کو ساکن کر دے۔ یعنی وجود اضافی کو اپنی ذات میں بالفعل سے بالقوۃ کر دے۔ گویا حق تعالےٰ کی ہستی ایسی نہیں کہ جب وہ ممکنات میں تجلی فرما دے تب ظاہر ہوا اور تجلی نہ فرمانے کی صورت میں مثل ممکنات کے ہو جاوے جن کا کوئی عین ہی وجود میں ظاہر نہیں۔ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا۔ پھر ہم نے اس سایہ پر آفتاب کو دلیل و رہنما بنایا۔ آفتاب سے ظل نمائی ظہور میں نہ آتی تو آفتاب کی روشنی کو کوئی نہ پہچانتا۔ اگر آفتاب ایک ہی حالت پر قائم رہتا اور صبح و شام نہ ہوتی اور سایہ کی طوالت میں کمی بیشی نہ واقع ہوتی رہتی تو نہ کسی کو نور کا شعور ہوتا نہ کوئی اس نور کو آفتاب سے نسبت دیتا۔ گویا آفتاب کے نور سے سایہ پہچانا جاتا ہے۔ اور سایہ سے آفتاب کا نور۔ وہ آفتاب اسم نور ہے جس سے وجود ظلمی کی شناخت ہوتی ہے۔ ثُمَّ

قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا ۔ پھر ہم اس کو اپنی طرف تھوڑا تھوڑا اور آہستہ آہستہ کر کے لیتے ہیں ۔ یہ اس لئے کہ وہ اسی کا ظل ہے اور اسی کی طرف جملہ امور پلٹتے ہیں ۔ کیونکہ وہ ہر چیز کی اصل ہے پس جملہ تعینات باعتبار ہویت حق کے حق تعالےٰ ہی کا وجود ہے اور باعتبار صورتوں کے اختلاف کے وہ سب تعینات اعیان ممکنات ہیں جس طرح صورتوں کے اختلاف سے ظل کا نام اس سے دور نہیں ہو سکتا اسی طرح اس اختلاف کی بناء پر عالم اور غیر حق کے نام بھی اس سے دور نہیں ہو سکتے ۔

جب عالم ایک ظل یا مجموعہ ظلال ہے تو عالم کا وجود اصلی نہیں بلکہ ظلی وہمی، خیالی اور اعتباری ہے حقیقت سے ناواقف خیال کرتا ہے کہ عالم حق تعالےٰ سے خارج ایک شئے زائد ہے، نیز یہ کہ عالم قائم بنفسہ ہے، حالانکہ دراصل ایسا نہیں ۔ سایہ کو اصل سے جو اتصال ہے اس کا ٹوٹنا محال ہے ۔ کوئی چیز سایہ کو اصل سے جدا نہیں کر سکتی ۔ ہر شخص اپنے عین کو پہچاننے کی کوشش کرے تو اسے معلوم ہو جائیگا کہ وہ کون ہے ؟ اس کی ہویت کیا ہے ؟ کس اعتبار سے اس پر کون سا اسم صادق آتا ہے ؟ جہت حق اس کی کونسی ہے اور جہت خلق کونسی ؟ اس معرفت کی کمی وبیشی پر عارفوں کی بصیرت کی کمی وبیشی کا تفاوت ہے ۔ اس کمی وبیشی کی مثال یہ ہے کہ ایک آئینہ خانہ متصور کرو جسمیں بیشمار چھوٹے اور بڑے سیدھے اور ٹیڑھے صاف اور دھندلے، سپید اور رنگ برنگ کے آئینے ٹکے ہوئے ہیں جن پر ایک ہی رنگ کی روشنی پھینکی جا رہی ہے ۔ دیکھنے والے کی نگاہ میں آئینہ کی رنگت اور صورت کے مطابق وہ روشنی بھی رنگ و صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ حالانکہ اس روشنی کا اصلی رنگ و صورت وہ نہیں ۔ چھوٹے آئینے میں چھوٹی اور بڑے آئینہ میں بڑی صورت نظر آتی ہے ۔ سیدھے میں سیدھی اور ٹیڑھے میں ٹیڑھی ۔ صاف آئینہ میں صاف اور دھندلے میں دھندلی نظر آتی ہے ۔ اسی طرح جو بندہ بوجہ اپنی صفائی کے حق تعالےٰ کے ساتھ زیادہ متحقق ہو جاتا ہے اس میں حق تعالےٰ کے مظاہر زیادتی کے ساتھ ظاہر ہونے لگتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں کہ حق تعالےٰ ان کے لئے سمع و بصر و کلام اور کل قویٰ و جوارح بن جاتا ہے

لیکن باوجود اس قرب واتصال کے بندہ ظل ہی رہتا ہے۔ یہ بندہ بوجہ اپنی صفائی کے ایک ایسا شیشہ ہوتا ہے کہ اسے ظل نوری کہتے ہیں۔ ہر شخص بوجہ ظل ہونے کے محض خیال ہوتا ہے اور اس بندہ کے جملہ مدرکات اور یہ تمام موجودات جس پر غیر حق کا اطلاق ہوتا ہے خیال در خیال ہے۔ وجود حق باعتبار اپنی ذات وعینیت کے اللہ ہی ہے نہ کہ باعتبار اسماء کے جن میں کثرت ہے۔ ہستی میں احدیت ہے اور خیال میں کثرت جو کثرت میں قائم رہا وہ عالم میں اسماء الٰہیہ اور اسماء کونیہ کا قرین رہا۔ اور جو احدیت پر قائم رہا اسے اس ذات اقدس کی معیت حاصل ہوئی جو غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ ہے۔ یہ استغناء اسماء سے بھی ہے۔ اور مسمیات سے بھی۔ اللہ تعالےٰ کی وہ احدیت جو باعتبار اسماء الٰہیہ کے ہے۔ احدیت الکثرت کہلاتی ہے۔ اور وہ احدیت جو ان اسماء سے مستغنی ہونے کی جہت سے ہے، احدیت عینی کہلاتی ہے۔ ان دونوں جہتوں پر اسم احد کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظلال ہی کی بدولت اور ظلال کے داہنے بائیں کروٹیں لینے کے سبب سے بندہ کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور بندہ پہچاننے لگتا ہے کہ اس کو حق تعالےٰ سے اور حق تعالےٰ کو اس سے کیا نسبت ہے؟ ماسوائے کیوں فقر وناداری ونیستی سے متصف ہے اور حقیقت الٰہیہ کی جانب اسے کیونکر احتیاج کلی ہے؟ اور حق تعالیٰ کے لوگوں اور عالموں سے مستغنی ہونے کی کیا حقیقت ہے؟

عالم اللہ کا محتاج ہے بسبب اسماء الٰہیہ کے۔ اور اسماء الٰہی وہ اسماء ہیں جن کے تحت میں عالم کے لوگ اور عالم کی چیزیں باہم ایک دوسرے کی محتاج ہیں یا عین ذات حق تعالےٰ کی محتاج ہیں کیونکہ ہمارے اسماء یا ہماری ذات بھی اللہ ہی کے اسماء ہیں۔ اور ہمارے اعیان نفس الامر میں اسی کے ظل ہیں۔ اور اس کے غیر نہیں۔ باعتبار حقیقت کے وہ ہماری ہویت ہے لیکن باعتبار تقید کے وہ ہماری ہویت نہیں۔ لہٰذا وہ مِنْ وجہٍ بندہ کی ہویت ہے اور من وجہٍ بندہ کی ہویت نہیں۔

اب ذرا آیت نور کی بھی سیر فرما لیجئے جس کو اس مضمون سے قوی تعلق ہے:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِہٖ
کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِیْ
زُجَاجَۃٍ ط اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ
دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ
لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ لَّا یَکَادُ زَیْتُھَا
یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی
نُوْرٍ ط یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَ
یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ط وَاللّٰہُ
بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ (النور ع ۵)

اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔ اس کے
نور کی مثال مانند طاق کے ہے۔ جس کے بیچ میں
چراغ ہو۔ وہ چراغ شیشہ کی قندیل میں ہے شیشہ
کی وہ قندیل گویا کہ تارہ ہے چمکتا ہوا۔ روشن کیا
جاتا ہے۔ وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت سے
جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ نزدیک ہے کہ تیل اس کا روشن
ہو جاوے۔ اگرچہ نہ لگے اس کو آگ۔ نور پر نور ہے
اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی جانب ہدایت فرماتا
ہے۔ اور یہاں فرماتا ہے مثالیں واسطے لوگوں کے
اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے:۔

سموات سے یہاں ارواح مراد ہیں اور ارض سے اجساد۔ مشکوٰۃ جسم انسانی ہے۔ مصباح روح ہے جو مثل چراغ کے روشن اور روشن کنندہ ہے۔ زجاجہ قلب عبد ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے نور وجود سے آسمانوں اور زمین کا اشراق فرمایا بعد اس کے کہ جو حجابات اس کے اور ان کے درمیان تھے انہیں وہ اٹھا چکا تھا۔ حجابات کے اٹھا دینے سے یہ مراد ہے کہ آسمانوں میں اور زمین میں اور جو کچھ ان میں ہے ان میں اللہ تعالےٰ نے اپنا نور قبول کر لینے کی صلاحیت پیدا فرما دی جس طرح کہ آئینہ میں صیقل کر دینے سے صورتوں کے قبول کرنے کی آئینہ میں صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالےٰ کے نور کے اس عالم میں ہونے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ روح انسانی بدن انسانی میں مصباح یعنے روح ہے۔ یہ روح قلب یعنے زجاجہ میں ہے۔ شجرۃ مبارکہ سے نفس انسانی مراد ہے انواع واقسام کے فیوض قبول کرنے کی قابلیت۔ لاشرقیۃ سے اشارہ ہے عالم مجردات کی جانب

نیز یہ اشارہ بھی ہے کہ اس میں کمالات بالفعل ہیں۔ اور لاغربیہ سے مراد ہے کہ وہ اجسام کثیفہ، ظلمانیہ میں سے نہیں۔ یکاد زیتہا سے یہ مراد ہے کہ اس میں خود ہی چمک اٹھنے کی استعداد موجود ہے۔ ولو لم تمسسہ نار یعنی حرارت غریزہ کا روح انسانی کے ساتھ کوئی مدبرانہ تعلق نہ ہو۔ نور علیٰ نور سے وہ نور مراد ہے۔ جو اس نور انسانی کے مافوق ہے اور وہ نور الٰہی ہے۔ یھدی اللہ لنورہ من یشآء اللہ تعالےٰ ہی جسے چاہتا ہے اس نور کی جانب رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ ویضرب اللہ الامثال للناس۔ یہ صرف مثالیں ہیں جو لوگوں کے لئے اس غرض سے بیان کی گئی ہیں کہ حقیقت حال تک پہنچنے میں لوگوں کو ذرا مدد ملے ورنہ حقیقت تو ان سے ماوریٰ ہے۔ واللہ بکل شیٔ علیم۔ اور ہر قسم اور چیز کے پورے پورے علوم یعنی جمیع علوم ظاہری و باطنی کا خزانہ حق تعالےٰ ہی کے پاس ہے۔ وہ اس میں سے جتنا جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

القاء - الہام - وحی

ہر وہ چیز جو بطریق استدلال حاصل نہ کی گئی ہو بلکہ قلب سالک پر حق تعالےٰ کی جانب سے یقین کامل کے ساتھ وارد ہوئی ہو القاء ہے یا الہام ہے یا وحی ہے۔

ابتداءً سالک کے قلب پر خطرات رحمانی وارد ہوتے ہیں۔ انتہا میں جاکر حق تعالےٰ سے مکالمت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت کو القاء اور انتہائی حالت کو الہام اور وحی کہتے ہیں۔ وحی چونکہ القاء و الہام کی انتہائی اور کامل ترین صورت کا نام ہے اس لئے اس لفظ کا استعمال

کبھی کبھی القاء و الہام کے معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ بلکہ دل میں وسوسہ ڈالنے کے معنی میں بھی استعمال کر دیا جاتا ہے۔ وسوسہ ڈالنے والا خواہ کوئی بھی ہو۔ مثلاً حق تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ (۶:۱۴)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیاطین پیدا کئے کچھ آدمی اور کچھ جن جنمیں سے بعض بعض کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔

لیکن اس مضمون میں وساوس شیطانی سے بحث نہیں بلکہ اس القاء و الہام اور ان خطرات رحمانی سے بحث ہے جو حق تعالےٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر وارد ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کو الہام ہوتا ہے۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوتی ہے۔ الہام حق تعالیٰ کی جانب سے بندہ پر بلا کسی فرشتہ کی وساطت کے اس جہت سے فائز ہوتا ہے جو حق تعالےٰ

کو ہر موجود کے ساتھ ہے وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا [اور ہر ایک کے لئے ایک جہت ہے کہ وہ منہ پھیرتا ہے اس کی طرف (۲:۱۸)] سے اسی جہت کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے۔ وحی فرشتہ کے واسطے سے ہوتی ہے۔ اسی بناء پر حدیث قدسی کو وحی و قرآن نہیں کہتے۔ وحی کشف شہودی و معنوی دونوں ہے۔ الہام صرف کشف معنوی ہے۔ وحی مخصوص بہ نبوت ہے، ظاہر سے متعلق ہے۔ اور تبلیغ کے ساتھ مشروط ہے۔ الہام ولایت کے ساتھ مخصوص ہے اور تبلیغ کے ساتھ مشروط نہیں۔

یہ اجمال کسی قدر تفصیل کا محتاج ہے جو حسب ذیل ہے:۔

حق تعالےٰ کا تعلق کائنات کیساتھ اس نوع کا نہیں جس نوع کا تعلق کہ ایک گھڑیساز یا گھڑی رکھنے والے کا گھڑی کے ساتھ ہوتا ہے۔ گھڑی ساز گھڑی کے کل پرزوں کو بناتا ہے درست کرتا ہے اور انہیں ترتیب دیکر گھڑی کو چلا دیتا ہے یا گھڑی رکھنے والا رات دن میں ایک بار گھڑی کو کوک دیتا ہے۔ اور چوبیس گھنٹے کے لئے اس سے فراغت پالیتا ہے۔ گھڑی خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اور دوسرے دن تک اپنی رفتار قائم رکھنے کے لئے اپنے مالک کے چابی دینے یا گھڑی ساز کی نگرانی کی محتاج نہیں ہوتی۔ حق تعالےٰ کو کائنات کے ساتھ اس قسم کا تعلق نہیں۔ بلکہ کائنات اپنے ابداع اور اپنی تخلیق کے بعد بھی اپنے قیام کے لئے ہر لمحہ اور ہر ساعت حق تعالےٰ کی توجہ کی محتاج رہتی ہے ایک لمحہ کے لئے نظر حق اس کی جانب سے ہٹ جائے تو ساری کائنات نیست و نابود ہو جائے۔ حق تعالےٰ ہر وقت کائنات کی جانب متوجہ رہتا ہے۔ اس متوجہ رہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی ذات و صفات سے کائنات پر متوجہ رہتا ہے۔ صفات میں ایک بہت بڑی صفت صفت کلام بھی ہے جس سے حق تعالےٰ اپنی مخلوق کی جانب ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی کوئی صفت کسی وقت بھی معطل نہیں رہتی۔ وہ اپنی مخلوق کے ہر فرد سے اس فرد کی استعداد کے مطابق ہمکلام ہوتا رہتا ہے

کسی کو براہ راست ہمکلامی کا شرف عطا فرماتا ہے جیسے کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا یعنی اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السّلام سے خوب گفتگو کی۔ کسی سے وحی کے ذریعہ کلام فرماتا ہے کسی سے ہمکلامی کی یہ شان ظاہر فرماتا ہے کہ فرشتے کے ذریعہ اس کے دل میں جو چاہتا ہے القاء فرماتا ہے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السّلام کی والدہ کے دل میں القاء فرمایا تھا۔ نیز عیسےٰ علیہ السّلام کی والدہ کے دل میں القاء فرمایا تھا۔ کسی سے مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ یعنے پردہ کے پیچھے سے کلام فرماتا ہے کسی کے دل میں براہ راست یعنی بلا وساطت فرشتہ جو چاہتا ہے القاء فرماتا ہے۔ جیسے شہد کی مکھی کو القاء ہوتا ہے اور اس القاء کو بھی وحی سے تعبیر فرمایا جاتا ہے چنانچہ حق تعالےٰ فرماتا ہے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (اور وحی فرمائی تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف) کسی سے بذریعہ خواب ورویائے صالحہ باتیں ہوتی ہیں غرض کہ ہمکلامی کی جتنی شانیں اور جتنے ذرائع ہیں خواہ وہ القاء کے نام سے موسوم ہوں۔ خواہ الہام کے نام سے خواہ کسی اور نام سے وہ سب حقیقت وحی ہی کی مختلف اقسام یا مختلف فروع ہیں صرف قوت اور کمزوری یا کشف وحجاب کے اختلافات سے مختلف اسماء سے وہ مختلف فروع موسوم ہیں۔ اور سب سے زیادہ واضح طریقہ ہمکلامی کا وحی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تو اس وحی اصطلاحی کی صحیح تعریف حسب ذیل ہوگی۔

"وحی کلام الٰہی ہے جو عالم غیب سے عالم شہادت کی جانب بذریعہ ایک مقرب فرشتہ کے جنہیں جبرئیل (علیہ السّلام) کہتے ہیں۔ رسولوں کے پاس پہونچایا جاتا ہے"

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا	اور نہیں طاقت کسی بشر میں یہ کہ کلام کرے (بالمشافہ)
وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ	اس سے اللہ مگر بذریعہ وحی کے یا پردہ کے پیچھے سے
رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا یَشَاءُ اِنَّہٗ	یا کسی (فرشتہ) کو پیغامبر بنا کر بھیجے پس وہ اسکے حکم

عَلِیٌّ حَکِیْمٌ ۝ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

(الشوریٰ۔ رکوع ۵)

سے وہ چاہتا ہے جی میں ڈالدیوے تحقیق وہ بلند مرتبہ حکمت والا ہے اور اسی طرح وحی کی ہم نے طرف آپ کے (اے محمد) روح کو ساتھ حکم اپنے کے نہ جانتے تھے آپ کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان ولیکن کیا ہے ہم نے اس کو نور۔ ہدایت کرتے ہیں ہم ساتھ اس کے جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے اور تحقیق آپ البتہ ہدایت کرتے ہیں۔ طرف سیدھی راہ کے۔

بلحاظ ضعف وقوت اور بلحاظ زیادہ واضح اور کم واضح ہونے کے وحی کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ سب سے زیادہ قوی اور اکمل ہے اس مرتبہ میں علوم غیب اللہ کی طرف سے رسول کی عقل پر ظاہر کئے جاتے ہیں اور رسول کے نفس میں ان علوم کو اس طرح منقش کیا جاتا ہے کہ رسول انہیں اپنے دل میں یاد رکھ سکے اور دوسروں کے سامنے بیان بھی کر سکے۔

اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالےٰ بلا واسطہ کلام کرے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حق تعالےٰ فرماتا ہے وَکَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (اور اللہ تعالےٰ نے موسیٰ سے خوب گفتگو کی) اور ہمارے حضور کے متعلق فرماتا ہے فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی (اپنے بندے کی طرف جو کچھ وحی کرنی تھی وہ کردی) اسے وحی صریح کہتے ہیں۔

وحی کے پہلے مرتبہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کلمات مقررہ اور عبارات معینہ کے ساتھ نازل ہوں اور حروف وصورت رسول کے کانوں تک پہنچادیں اور معانی ان کے قلب میں القاء کریں۔

یہ دونوں صورتیں انبیاء کے لئے مخصوص ہیں۔

دوسرا مرتبہ جو پہلے مرتبہ کے مقابلہ میں کمزور اور کمتر درجہ کا ہے یہ ہے کہ کلام الٰہی اس نفس تک پہنچ جائے جو اس کلام کے قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد رکھتا ہو جیسے کہ موسیٰ علیہ السّلام کی والدہ کے دل میں اللہ تعالےٰ نے یہ بات ڈال دی کہ وہ موسیٰ علیہ السّلام کو دودھ پلا کر صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیں۔ اِذْ اَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّکَ مَا یُوْحٰٓی ۝ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ فَاقْذِفِیْهِ فِی الْیَمِّ ۝ [جس وقت کہ وحی ڈالی ہم نے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے اب یہ کہ ڈال دے اس کو بیچ صندوق کے پس ڈالدے اس کو بیچ دریا کے (طٰہٰ۔ ع ۲)]

اس وحی خفی اور تعلیم سرّی کے القاء نے ان کی والدہ کے نفس کو خواب جہالت سے بیدار کر دیا اور ان کا دل اپنے بیٹے کے متعلق تردد اور دشمنوں کے خوف سے مامون ہو گیا۔ اسی نوع کی وحی عیسیٰ علیہ السّلام کی والدہ حضرت مریم کو بھی ہوئی تھی جبکہ درخت کے نیچے سے ان کو آواز آئی کہ غمگین مت ہو۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا۔ [پس پکارا اس کو (یعنی مریم کو) اس (درخت) کے نیچے سے کہ غم مت کھا۔ تحقیق تیرے پروردگار نے تیرے نیچے چشمہ کر دیا ہے۔ (مریم ع)]

یقینی امر ہے کہ موسیٰ علیہ السّلام کی والدہ اور عیسیٰ علیہ السّلام کی والدہ پیغمبر نہ تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی کا یہ مرتبہ جسے القاء اور الہام کہتے ہیں حق تعالےٰ نے ان لوگوں کیلئے بھی رکھا ہے جو نبی یا رسول نہیں خضر علیہ السّلام کو علم لدنی کی تعلیم ہوئی جن کی بابت حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (اور ہم نے ان کو اپنے خاص علم میں سے تعلیم کیا (الکہف ع ۹)) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:۔ اِنَّ اللّٰهِ فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ عِبَادٍ مُحَدَّثُوْنَ وَاَشَارَ اِلٰی بَعْضِ اَصْحَابِهٖ۔ یعنی بیشک ہر امت کے اندر اللہ تعالےٰ کے ایسے بندے ہیں۔

جن سے اللہ تعالےٰ ہمکلام ہوتا ہے پھر آپ نے اپنے بعض اصحاب کی جانب اشارہ فرمایا بعض روایات کی رو سے حضرت عمرؓ کی جانب اشارہ فرمایا۔

تیسرا مرتبہ وحی کا جو دوسرے مرتبہ سے بھی ضعیف تر ہے یہ ہے کہ حق تعالےٰ نفوس کو ان کاموں کی تعلیم فرماتا ہے جو ان نفوس کے مقاصد سے متعلق ہیں۔ اور وہ نفوس اس وحی کے سبب سے ان صنایع و بدایع کا استخراج کرتے ہیں جو ان کی قوت اور استعداد کے اندر ہیں۔ جیسے مکڑی کا جالا بنا۔ ریشم کے کیڑے کا ریشم تیار کرنا۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وَ اَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا (وحی کی تیرے رب نے طرف شہد کی مکھی کے کہ پہاڑوں میں اپنا گھر بنا (النحل۔ ع۹)

مکھی پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا۔ نہ اللہ تعالےٰ نے حروف و صوت سے اسے خطاب فرمایا۔ بلکہ اس میں ایک بات کی استعداد پیدا کر کے اس کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اپنی استعداد کو جنبش میں لائے اور اپنا کام کرے۔

نفوس ناطقہ جب ایک حد تک کمالاتِ معنوی حاصل کر لیتے ہیں۔ طبیعت کی کدورتوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ خواہشات کی قیود سے آزاد اور بشریت کے مقتضیات سے برتر ہو جاتے ہیں تو فطرتاً ان کی توجہ عالم سفلی سے ہٹ کر عالم علوی کی جانب مائل ہوتی ہے۔ خصائل ملکوتی کا ان پر غلبہ اور علوم آسمانی کی تحصیل کا شوق انہیں دامنگیر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ملائکہ کی ہمنشینی کا انہیں شرف حاصل ہوتا ہے اور اس ہمنشینی سے وہ راحت پاتے ہیں۔ ان ہی ملائکہ کے واسطہ سے خوش قسمت نفوس کو کلام الٰہی سننے کی دولت نصیب ہوتی ہے اور صحبت ملائکہ کے اثرات سے متاثر ہو کر وحی کی مختلف شاخوں اور عالم قدس کے مختلف پھول پتوں اور علوم غیب کے مختلف پھلوں سے وہ شکم سیر ہوتے ہیں۔

علم کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ ظاہری طریقہ تو وہی معمولی طالب علم کا طریقہ ہے جو بہت عام ہے۔ اور باطنی طریقہ مراقبہ اور تفکر کا ہے۔ مراقبہ اسے کہتے ہیں۔ کہ دل کو دوسرے خیالات سے ہٹا کر ایک ہی خیال پر جما دیا جائے۔ اور اسی خیال کے اندر فکر میں منہمک ہو جائے۔ اور تفکر یہ ہے کہ نفس ان علوم کو جو کہ اپنے سے مخفی ہیں۔ مدت اور حیلہ اور آلہ کے ساتھ تلاش کرے۔ ایک تیسری چیز اور ہے۔ جسے حدس کہتے ہیں۔ تفکر اور حدس میں یہ فرق ہے کہ تفکر میں تو غور و خوض سے اور طبیعت پر زور ڈال کر کوئی بات معلوم کیجاتی ہے۔ لیکن حدس میں بغیر سوچے سمجھے اور بلا غور و خوض اور بغیر آلہ یا حیلہ کے دفعتہً ایک بات قلب میں القاء ہو جاتی ہے۔ صاحب حدس یک بیک غیب کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ اور یکبارگی علم مطلوبہ اس پر منکشف ہونے لگتا ہے۔ بغیر اس کے کہ عرصہ گذرے اور بغیر اس کے کہ وہ ریاضت میں مشغول ہو۔ حدس بمقابلہ فکر کے نفوس کاملہ سے اقرب ہے حدس سے فراست پیدا ہوتی ہے۔ اور فکر سے کیاست۔ کیاست اس زیرکی و دانائی کو کہتے ہیں جس کا تعلق دماغ سے ہے۔ اور فراست اللہ کا اک نور ہے جس سے مومن دیکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے" یہی فراست ہے جو حدس سے پیدا ہوتی ہے۔ حدس ہی الہام کا زینہ ہے۔ اور نبوت زینہ ہے وحی کا۔

جب نفس انسانی حدس کی قوت سے عالم بالا کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ اور علوم غیبیہ کے انوار اس پر چمکنا شروع ہوتے ہیں۔ تو ان علوم کا اظہار اس پر رمز کے حجاب اور اخفا و ابہام کے پردوں کی آڑ میں ہوتا ہے۔ پھر اگر نفس میں اتنی قوت نہیں کہ حالت بیداری میں اس ظہور کا متحمل ہو سکے تو یہ جلوے اسے خواب میں دکھلائے جاتے ہیں۔ اور غیب کے اسرار عالم رویا

کی صورتوں اور شکلوں اور مثالوں میں متمثل کر کے اس پر منکشف کئے جاتے ہیں۔

عالم رویا کے ذریعہ انکشاف حاصل کرنے کا مرتبہ الہام سے بھی کمتر ہے۔ الہام کا مرتبہ فرشتہ کے نازل ہونے سے جسے وحی کہتے ہیں۔ اور وحی کا مرتبہ صریح مکالمہ سے جسے وحی صریح کہتے ہیں کمتر ہے۔ اسرار غیب کے ظہور کی انتہائی شان صریح مکالمہ کی شکل میں اولوالعزم رسولوں کے لئے مختص ہے۔ وحی انبیاء میں سے رسولوں کے لئے مختص ہے۔ وحی فی المنام یعنی خواب میں وحی ہونا محض انبیاء کے لئے ہے۔ الہام کی دولت سے اولیاء اللہ نوازے جاتے ہیں۔ ان اولیاء اللہ کے نفوس ظاہرہ جب اپنے عنصری قالبوں کی قید سے رہائی پاکر آسمانِ مکاشفہ کی بلندیوں پر پرواز فرماتے ہیں تو اللہ تعالےٰ ان سے ان کے مقام معاد میں۔ خطاب صریح کے ساتھ کلام فرماتا ہے جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ما من عبدٍ الا وسیکلمہ ربہ لیس بین العبد والرب ترجمان ولا واسطۃ (متفق علیہ) یعنی ہر ایک مومن بندے سے خداوند تعالےٰ کلام فرمادیگا۔ اور اس وقت خدا اور مومن بندے کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہوگا نہ کوئی واسطہ۔

القاء اور الہام میں کسب کو کسی قدر دخل ہے۔ مگر وحی میں کسب کو مطلق دخل نہیں۔ ریاضت اور مجاہدہ سے یہ دولت ہاتھ نہیں آتی جس طرح نبوت محنت و مجاہدہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ وحی بھی کوشش انسانی سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ الہام کے ذریعہ صرف معانی کا انکشاف ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعہ معانی کا بھی انکشاف ہوتا ہے اور کثائف تنزیلات کا بھی اور نزول روح القدس یعنی جبرئیل کا بھی۔ روح القدس اور جبرئیل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جبرئیل میں لطافت کا جب غلبہ ہوتا ہے تو وہ روح القدس ہوجاتے ہیں اور جب ایسی صورت اختیار کرلیتے ہیں کہ مکشوف ہوسکیں تو وہ جبرئیل ہوجاتے ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے تو روح القدس

یا روح الامین معانی کو رسول کے قلب میں منقش کرتے ہیں۔ اور الفاظ و عبارت کو جبرئیل رسول کے کان میں القا کرتے ہیں۔ پھر مسموع اور معقول کان اور دل کی راہ سے ذات رسول میں مجتمع ہو جاتے ہیں اور رسول کی زبان و توجہ ان دونوں کے فیضان میں مصروف ہو جاتی ہے

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (الشعرء ع)

"روح الامین نے (یعنی جبرئیل نے) اپنی شان لطافت سے اس کو تمہارے قلب پر نازل کیا ہے تاکہ تم عذاب الٰہی سے ڈرانے والوں میں سے ہو اور اس کو عربی زبان میں جو سب زبانوں میں روشن اور بین ہے نازل کیا ہے۔

انبیا وحی کی قوت سے ان چیزوں کو دیکھ لیتے ہیں جن چیزوں کو اولیاء اللہ الہام کی قوت سے نہیں دیکھ سکتے انبیاء کلمات وحی کو اپنے کانوں سے سنتے ہیں۔ معانی کو دل میں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ الہام میں سوائے انکشاف معنی مجردہ مخفیہ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

قرآن مجید اور جرمنی

ترجمہ تقریر بیرن عمر رالف ایہرن فلس

آسٹریا کے نومسلم امیر عمر رالف ایہرن فلس حال میں ہندوستان تشریف لا چکے ہیں۔ ان سیاحت کے دوران میں چند روز ان کا قیام حیدرآباد میں بھی رہا۔ انہوں نے مجلس تحریک قرآنی کی استدعا پر ایک تقریر عنوان مندرجہ بالا پر کی تھی۔ جسے عموماً پسند کیا گیا۔ مولوی سید شریف الحسن صاحب بی۔ اے نے اس کا ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ جناب ذوقی شاہ صاحب کے حواشی بھی ہیں جن میں انہوں نے بیرن عمر کے بعض خیالات کی اصلاح فرمائی ہے۔ ذیل میں وہ تقریر مع حواشی درج کی جاتی ہے)۔

جرمنی اپنی اصلاح کے لئے سرگرم عمل ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی زندگی میں ایک نئی روح پھونکنے والا ہے۔ موجودہ سیاسی اور ذہنی حالات سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں جرمنی کو جو مصیبتیں اور تمدنی شکستیں اٹھانی پڑیں ان سے جرمنی کی قوتوں کو بالکل نقصان نہ پہنچ سکا۔ فنا کرنا تو درکنار یہ مشکلات ان قوتوں کو کمزور تک نہ کر سکیں۔

جرمنی میں سرعت کے ساتھ جو تغیرات واقع ہو رہے ہیں ان سے ایک اجنبی شخص یہ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ کہ جرمن قوم کی اخلاقی اور قومی قوتیں بالکل زائل ہو چکی ہیں لیکن حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے اُس قوم کی ذہنیت زندگی کی نئی حالتوں اور نئے نئے نصب العین تلاش کرنے میں بہت مضبوط ہے۔ دیانت دار اور اخلاص پسند واقع ہوئی ہے۔ کیونکہ زندگی کے پرانے اصول اور نصب العین ایک ایسی یورپین قوم کو ہرگز مطمئن نہیں کر سکتے جو حقیقتہً متمدن ہے اور ہمیشہ نئے اصولوں کی تلاش میں منہمک رہتی ہے۔

آج کل جرمنی میں دو جماعتیں ہیں جو ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ ان میں سے ایک تو بالکل بین الاقوامی خیال کی ہے اور وہ اس خیال کی بھی تائید کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ فوجی قوت سے اپنی حفاظت کی جائے دوسری جماعت خالص قومیت کی حامی ہے اور وہ فوجی قوت اور جنگ کی مخالف نہیں ہے اگرچہ یہ امر یقینی ہے کہ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد یہ دونوں فریق اپنے اپنے خیالات میں ترمیم کر لیں گے لیکن ان دونوں میں سے کسی میں بھی روحانیت نہیں ہے کہ اسکی روشنی میں وہ انسان کے ذاتی اور ذہنی نصب العین متعین کر سکیں۔ ہاں البتہ چند اصول ایسے ہیں جو پوری قوم کی بھلائی یا متفرق جماعتوں کی بہبود میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انفرادی اور قومی قوتوں کا ارتقاء کسی نہ کسی نئے نصب العین یا مدار حیات کی بناء پر ہوا ہے۔

اس لئے یہ امر غالب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید جیسی لبریز ہدایت کتاب جس میں سوشل مشکلات کے حل کے ساتھ ساتھ انفرادی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایات بھی موجود ہیں۔ جرمنی کے لئے موجودہ حالت میں بے نظیر مددگار ثابت ہوگی۔ میرا یہ خیال بالکل قرین قیاس معلوم ہوگا اگر ہم اس واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کا موجودہ زوال قرآنی تعلیمات سے

بے خبری کی وجہ سے ہے نہ کہ قرآنی تعلیمات کی وجہ سے جیسا کہ کسی زمانہ میں باور کیا جاتا تھا۔

اپنے اس خیال کی تائید میں میں حیدر آباد کی مثال پیش کرتا ہوں جہاں ۹۵ فیصدی ہندو آبادی اور ایک بہت ہی مختصر سی مسلمان آبادی کے درمیان پورا پورا اتحاد اور رواداری کا تعلق قائم ہے یہاں قرآن شریف کے دو بنیادی قواعد پر عمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ ملک اس قدر خوش و خرم ہے۔ سب سے پہلے تعلیم و تعلم کا چرچا ہے جس میں اس ملک کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مجھے مرزا اکبر حیدری کے اس لیکچر کو جو انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعہ پر دیا تھا سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ قرآن کی ہدایات کے مطابق تعلیم و تعلم میں منہمک رہنے کا جذبہ تھا جس نے اس خوبصورت جامعہ کے قیام میں رہنمائی کی۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اس مشہور سیاسی مدبر سے گفتگو کر کے یہ محسوس کیا ہے کہ قرآن کے اصول رواداری پر عمل پیرا ہونے اور پیغمبر صلعم کی تعلیم کی خوبیوں کو سمجھنے کا شوق اس ملک کے لوگوں پر اس قدر غالب ہے کہ وہ سب سے پہلے بنی نوع انسان کی فلاح اور ریاست کی بہبود مدنظر رکھتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی اپنی قوم کی بھلائی دیکھتے ہیں۔

میں نے اعلیحضرت نظام دکن سے شرف ملاقات حاصل کیا وہ اسلامی سادگی اور لینت اخلاق کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ملاقات سے میرے اوپر ایک ایسا اثر ہوا جو کبھی نہ مٹے گا۔ میں اعلیحضرت کے سب سے بڑے صاحبزادے سے بھی ملا جو ولیعہد ہیں اور صدر اعظم سے بھی ملاقات کی جو ایک سچے ہندو کی طرح اسی اخلاص و انہماک سے تمام ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ ان سب سے ملکر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرا مذکورہ بالا خیال بالکل صحیح ہے۔

آج ممالک اسلامیہ محض اس بنا پر مبتلائے ادبار ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی ہے۔ جہاں جہاں اور جن جن ممالک میں قرآن کے ان دو بنیادی قواعد تعلیم اور رواداری پر صحیح معنی میں

عمل ہو رہا ہے، وہ ممالک ترقی کر رہے ہیں پس میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جرمنی کا جوش تجسس ان خزائن حکمت کو نظر انداز نہیں کرے گا جن سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔

لیکن مشرقیوں نے ابتک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہوگا۔

ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ جرمنی میں قرآن مجید کا رسماً کوئی احترام نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت بالکل تاریخی ہے اور وہ علم السنہ میں مدد دینے والی ایک کتاب سمجھی جاتی ہے قطع نظر اس کے اگر ہم اس کی مذہبی حیثیت معلوم کرنا چاہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اگر کوئی انقلابی کتاب نہیں سمجھی جاتی تو ایک بالکل نرالی کتاب ضرور سمجھی جاتی ہے صرف یہی واقعہ اس امر پر کافی روشنی ڈالتا ہے کہ وہ لوگ جو جرمنی میں قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات قرآن کے متعلق کس قدر غیر رسمی اور غیر قدامت پسند ہیں۔ ہم یہ بات فراموش نہیں کر سکتے کہ مشرقی اور مغربی طرز تخیل طریق تجسس اور اصول حیات میں بین فرق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب ہماری مقدس کتاب پر ایک مغربی نگاہ پڑے گی تو قرآن کے نئے معانی اور اسکو سمجھنے کے نئے اصول پیدا ہو جائینگے اور میرے خیال میں یہ کسی صورت سے مضر نہ ہوگا بلکہ خداوند کریم کی طرف سے ایک رحمت ہوگی کیونکہ قرآن مقدس ہم کو بتاتا ہے کہ یہ بات انسانی سرشت میں داخل ہے کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو اور پھر خود ہی تحریف کر کے ان حیرت انگیز حقائق کا غلط استعمال کرے جو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے انسان تک پہونچائے ہیں اس لئے انسان کو اس امر کی ضرورت رہتی ہے کہ اس کی زندگی میں تازہ روح پھونکی جاتی رہے اور ازلی صداقتوں کے لئے تجدیدی جستجو جاری رکھی جائے۔

زمانہ کے ساتھ انسان کی ذہنی اور جسمانی حالت بدلتی رہتی ہے۔ قدیم عربی، ایرانی، ترکی، اور ہندوستانی روایات اپنے زمانہ کے لحاظ سے حقائق ازلی کی بہترین تفسیریں تھیں لیکن جسطرح

سمندر کو انسان کے بنائے ہوئے ایک کوزے میں بھر دینا غیر ممکن ہے اسی طرح قرآن کے حقائق و معارف اور ان خوبیوں کو جو قرآن میں پوشیدہ ہیں ایک ہی انسانی، ارتقائی دور میں سمجھ لینا بھی ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے رہنے سہنے اور سوچنے کے طریقوں کو زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جرمنی کے قابل اور مذہبی آدمی قرآن کو جس طرح سمجھیں گے۔ وہ اُن تمام اُصول و مبانی سے مختلف ہوگا جن پر اسلامی روایات قائم ہوئی تھیں۔ پھر بھی اسلامی تہذیب کے قدیم مشہور رہنماؤں اور موجودہ یورپ کی نوخیز اسلامی تہذیب کے سربرآوردہ ارکان کے درمیان ایک قریبی رشتہ قائم رہیگا۔ یہ بالکل فطری امر ہے کیونکہ یورپ کو اسلامی تعلیم دینے کا بیڑا اسلامی دنیا کے سب سے زیادہ قدامت پسند حصہ یعنی ہندوستان نے اُٹھایا ہے۔ اس لئے کہ میں یقین کرتا ہوں کہ آج کل جرمنی اور دوسرے ممالک مغربی کے روحانی اور دماغی قابلیت رکھنے والے جو حضرات قرآن شریف کے مطالعہ میں منہمک ہیں ان کی کوششوں کا نہایت ہی دلپذیر نتیجہ یہ ہوگا کہ از سرِ نو قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے گا۔

اگر ہم اس بات کا یقین کر لیں کہ مشرق اپنے مذکورہ بالا مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ تو سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کے دماغ پر قرآنی تعلیمات میں سب سے زیادہ کونسی چیز اثر کرے گی؟

جرمن زبان بولنے والے ایک آسٹرین کی حیثیت سے میں یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ کم سے کم یورپ کا وہ حصہ جو جرمن بولتا ہے سب سے زیادہ قرآن کی اس تعلیم کی شگفتگی اور قابل عمل ہونے سے متاثر ہوگا جو وہ ہماری روح اور جسم کے ارتقاء کے مابین اتحاد پیدا کرنے کے بارے میں دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یسوع مسیح کی حیرت انگیز تعلیم کہ "حقیقتاً خدائی سلطنت تمہارے ہی درمیان ہے" وہی خیال ادا کرتی ہے جو قرآن کے وہ الفاظ ادا کرتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہم سے ہماری رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن بدقسمتی سے عیسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ کو یہ مفہوم پہنا دیا گیا کہ خدا مانند انسان کے ہے۔ جس کا مسکن آسمانوں کے اوپر ہے اگرچہ وہ انسان سے زیادہ شاندار اور مہربان خدا بھی ہے اور باپ بھی۔ بخلاف اس کے قرآنی تعلیم نہیں بدلی۔ بلکہ مختلف ادوار ارتقائی میں مختلف اور عارضی معانی بیان کئے گئے ہیں اور بالآخر وہ لوگ جو خلوص کے ساتھ اس کے معانی کی تلاش میں کوشاں ہیں ان کو ان الفاظ کا صحیح مفہوم یاد آجائے گا۔ اسی خیال کو اسلام کے احکام میں مدنظر رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عبادت کو لے لیجئے کہ قرآن مجید نے عبادت کے ساتھ حضور قلب کو کس درجہ اہمیت دی ہے۔ جس سے انسانی عمل اور انسانی تہذیب اور انسانی ذہنیت میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ایک نئی روح سرایت کر جاتی ہے۔ یورپ نے اپنی سائنس دانی کے زور سے فطرت کی بیرونی قوتوں پر حکومت کرنی سیکھ لی ہے۔ اس طرح انسانی قوت حد سے بڑھ کر ناقابل مقابلہ ہو گئی ہے۔ لیکن ان بیرونی قوتوں کے ارتقاء کے زمانہ میں انسان کی اصلی خوبی نے کچھ بھی ترقی نہیں کی۔ مخفی قوتوں کے حاصل ہو جانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان قوتوں کا مالک ان کو اچھے اور مفید مصرف میں لائیگا۔ ایک مالی جس کو دو بیلوں کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کا پانی کھینچیں اگر اس کو دو وحشی بیل دے دیئے جائیں جن کو وہ قابو میں نہیں لا سکتا اور وہ اپنی لڑائی سے اس کے باغ کے تمام پھولوں اور پودوں کو پامال کر ڈالیں، تو اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اگر وہ مالی ان کو رام کر لے تو وہی بیل اس کے لئے بہت فائدہ مند ہو جائیں گے۔ اس مثال سے آپ خود اندازہ کر لیں گے کہ یورپ میں اور خاصکر جرمنی میں ان قوتوں کی کیا حالت ہے جو انسانی قبضہ میں تو ہیں۔ لیکن انکا استعمال مواقع پر

نہیں کیا جاتا۔ ہماری روح کی اندرونی اصلاح ہی ہماری روح اور ہماری زندگی کے مابین خوشگوار رابطہ پیدا کر سکتی ہے۔ اگر یہ خوشگوار رابطہ قائم ہو جائے تو ہماری موجودہ مشکلات سب کی سب آج ہی حل ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ موجودہ مشکلات صرف معاشی ہی نہیں ہیں بلکہ موجودہ تہذیب اور اسکے نظام کی پیدا کردہ ہیں۔

علاوہ اس عام حکم کے قرآن شریف ہمیں صاف طور پر اپنی اجتماعی زندگی کو تعمیر کرنے کے قوانین بتاتا ہے۔ وہ تخیلی اشتراکیت کی طرح انفرادی عمل کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ کیا خوب بات ہے کہ بالشویک گورنمنٹ بھی عملاً اس قیمتی قوت کو نظر انداز نہیں کر سکی۔ جو انفرادی جوش عمل کا باعث ہوتی ہے۔ بخلاف اسکے قرآن کا صاف حکم یہ ہے کہ وہ لوگ جو دولت مند ہیں اور جو زیادہ دماغی قابلیت رکھتے ہیں اور جو جسمانی قوت میں زیادہ ہیں ان لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ان بھائیوں کی جو مالی یا ذہنی یا جسمانی اعتبار سے غریب اور کمزور ہیں مدد کریں اور ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ لوگ اپنے غریب بھائیوں کی ترقی اور اصلاح کے ذمہ دار ہیں۔ اس بارے میں جو اہم احکام ہیں ان کو ہر مسلمان جانتا ہے اور میں اس جگہ ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں سمجھتا اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر قرآنی تعلیمات کو جرمنی تک پہونچا دیا گیا تو کیا وہ ان پر اس سے بہتر طریقے سے عمل پیرا ہو سکیگا جیسا کہ آج کل بعض اسلامی ممالک میں عمل ہو رہا ہے میں امید کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ جرمنی ہمیشہ ہر کام کو پوری طرح انجام دینے کا خوگر رہا ہے پس اسلام موجودہ زمانے کی سوشل مشکلات پر حاوی ہونے میں ضرور معاون ثابت ہوگا۔

اسلام میں عورت کی حیثیت قرآن کی سچی تعلیم کے موافق اس سے بہت زیادہ اچھی ہے جو یورپ نے اس کو دی ہے یہ بات دوسری ہے کہ مقامی رسم و رواج اور رومی اور ایرانی اثرات کی بنا پر اور قرآنی حکم کو مختلف طور پر سمجھنے کی وجہ سے پردے کی رسم معاشرت میں داخل کر دی گئی ہے۔ میں

یہاں پر ایک آسٹرین نومسلم لیڈی بیرونس لطیفہ اے اوسلر کی رائے بیان کرتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں۔ کہ قرآن شریف کی رو سے جو معاشی اور طلاق کے حقوق عورت کو حاصل ہوئے ہیں وہ ان حقوق سے اچھے ہیں اور عورتوں کے لئے مفید ہیں جو قبل جنگ یورپ کے قوانین نے عورت کو دیئے تھے اور جو بعض بعض ممالک میں اب تک رائج ہیں۔ مشرقی ممالک میں جو عمل قرآنی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے وہ دوسرا سوال ہے اور اس کو یہاں بحث میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اب قرآن کی عملی تعلیم کا تیسرا سب سے زیادہ اہم حصہ قومی مسئلہ کا حل ہے جو حیرت انگیز طور پر کیا گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ قرآن نے مختلف مسلم اقوام کو آپس میں منافرت کرنے سے منع کیا ہے بلکہ وہ غیر مسلم افراد اور اقوام سے بھی دل آزار نہ برتاؤ کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اس پر بھی بس نہیں۔ مذہبی معاملہ میں قرآن نے صرف جبر و اکراہ ہی کو ممنوع قرار نہیں دیا۔ بلکہ ہم مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ ان بے شمار پیغمبروں کو بھی مانیں جو ہمارے پیغمبر صلعم سے قبل ہر ملک اور ہر قوم میں مبعوث ہو چکے ہیں۔ چاہے وہ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ بدھ ہوں یا کرشنا۔ یا چین کے لاؤسی ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی صحیح رواداری کا حیرت انگیز خیال ایک ایسا اطمینان بخش پیغام تھا جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اسلام بنی نوع انسان کے لئے ایک رحمت ہونے والا ہے صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسرے پیغمبروں کے پیروؤں کے لئے بھی۔

ان شاندار اور سب سے زیادہ اہم تعلیمات کے علاوہ قرآن ہماری پوشاک۔ ہمارے فرنیچر اور ہماری تعمیرات کے بارے میں ایک ایسا نیا طریق زندگی بتاتا ہے۔ جو اچھی طرح منظم ہے۔ سادہ ہے اور فطرت سے بالکل قریب ہے۔ یہ تقریر بہت طویل ہو جائے گی اگر میں تفصیل کے ساتھ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کروں کہ مشرق میں جو پوشاک اور دیگر رسوم رائج ہیں ان کی قرآن کس طرح مخالفت کرتا ہے اور کس طرح سادے اور تھوڑے کپڑے پہننے پر زور دیتا ہے جو جنوبی ممالک کی آب و ہوا

کے عین مطابق ہے کیونکہ ان مقامات میں زیادہ کپڑے ایک ناقابل برداشت بوجھ بن جاتے ہیں لیکن جیسا میں نے کہا جرمن قرآن کے سمجھنے میں ان روایات کا ہرگز تتبع نہ کریں گے جو مشرق میں رائج ہیں بلکہ حقیقی قرآن ہی کی پیروی کریں گے میں یہاں بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ موجودہ انقلاب نے جرمنی میں ایسے رجحانات پیدا کر دیئے ہیں جن کی وجہ سے جرمنی کے موجودہ طرز تعمیر اور فرنیچر اور پرانے عربی طرز میں مماثلت پیدا ہو گئی ہے (۴)۔

جہاں حالات اس امر کے موافق ہیں کہ جرمن قوم قرآنی تعلیم سے فائدہ اٹھائے وہاں اس امر کے امکانات بھی بہت کم ہیں کہ ان تعلیمات کو جرمنی تک پہنچایا جائے۔

اب تک قرآن شریف کے جرمنی میں متعدد ترجمے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو کسی مسلمان اور جرمن زبان کے ماہر نے کیا ہو۔ اب تک جو ترجمے ہوئے ہیں وہ علم الالسنہ کے ماہرین نے اپنے مقصد کو پیش نظر رکھ کر کئے ہیں۔ یہ لوگ نہ تو اس کی مذہبی تعلیمات اور اسکے حقائق پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ عربی متن کی خوبیاں ترجمہ میں ظاہر کر سکیں صرف ترجمہ کر لینا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ ترجمہ میں اصل کی خوبی اور روح ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ تاکہ پڑھنے والے کے دل پر پورا اثر ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے قرآن کا ترجمہ جرمنی زبان میں شروع کر دیا ہے ہمارے دوست مولانا صدرالدین جو یہاں موجود ہیں اس کام کو ڈاکٹر منصور پی ایچ ڈی کی مدد سے کر رہے ہیں میں ترجمہ پر زبان کو بہتر کرنے کی غرض سے نظر ثانی کروں گا۔ یہ مقتدر کام اس امر کا مستحق ہے کہ ہر مسلمان اس میں مدد دے۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی سچا مسلمان اسلام کی ترقی میں مدد دینے سے حتی الوسع پیچھے نہیں ہٹے گا۔ اس اسلام کو مدد دینے سے جو ہم سب کو اس قدر عزیز اور پیارا ہے +

بیرن عمر کی تقریر پر خیالات

پرانی چیزوں سے بلا وجہ بیزاری اور نئی چیزوں کے اشتیاق میں بلا ضرورت بے چینی طفلانہ ناعاقبت اندیش کا خاصہ ہے جس قوم کو تمدن و ترقی اور اعلےٰ تعلیم و تربیت اور عقل و فراست کا دعوےٰ ہو اسے اس طفلانہ ذوق سے دور رہنا چاہیئے اصل چیز تلاش حق ہے اس تلاش میں جدت و قدامت کے امتیاز کو کوئی دخل نہیں قدامت سے نفرت اور جدت سے رغبت یا اس کے برعکس کا تلاش حق پر کوئی اثر نہ پڑنا چاہیئے۔ علاوہ بریں انسانی نصب العین میں تغیر و تبدل کی گنجایش نہیں۔ وہ نصب العین جو ماضی میں کچھ اور تھا حال میں کچھ اور ہے اور مستقبل میں کچھ اور ہو جائیگا، سچا انسانی نصب العین نہیں ہو سکتا۔ محدود جماعتوں کا نصب العین حالات مقیدہ میں عارضی اور وقتی ہونا اور حالات کے بدل جانے پر اس کا متغیر ہو جانا اور بات ہے مگر جملہ بنی نوع انسان کے لئے سچا حقیقی اور مستقل نصب العین کسی تغیر کو قبول نہیں کرتا یورپ اگر اپنا نصب العین بدلنے کا مشتاق رہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یورپ کو ابھی تک صحیح نصب العین نصیب ہی نہیں ہوا۔ اور یہ حالات موجودہ اسے ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ اس تلاش میں جن علوم کو بیشتر دخل ہے ان سے یورپ بڑی حد تک ناآشنا ہے۔ قوانین قدرت کے متعلق جزوی و فروعی معلومات کے حصول میں محققین یورپ نے جو سعی بلیغ کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے اور کوئی عقلمند اور منصف مزاج شخص اس حیرت انگیز ترقی سے انکار نہیں کر سکتا جو سائنس کے میدان مغرب کو اس وقت تک حاصل ہوئی ہے۔ مگر باوجود ان جملہ

ترقیات کے امور نامعلوم کی بابت ان ممالک میں جو تاریکی چھائی ہوئی ہے وہ اتنی وسیع ہے کہ موجودہ علمی فتوحات کو اس جہل سے کوئی مناسبت ہی نہیں جہل کی اس شب تاریک میں سائنٹفک کامیابیوں کے جو جگنوں چمک رہے ہیں وہ باوجود اپنی چمک کے اس تاریکی کو دور نہ کر سکے۔ اہل یورپ کو خود اعتراف ہے کہ ان کے علوم ابھی ناقص ہیں ترقی کی گنجایش بہت کچھ باقی ہے۔ قدم قدم پر جدید انکشافات قبل کے مسلمات اور نظریوں کو درہم برہم کر دیا کرتے ہیں مگر یہ انکشاف ختم نہیں ہوتے کسی منزل پر آکر رکتے نہیں۔ ہم کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیتے کہ معلومات کے انتہائی نقطہ پر ہم پہنچ گئے۔ ہماری موجودہ تحقیقات پر ہم کو یہ اعتماد نہیں ہونے دیتے کہ کل یہ تحقیقات غلط ثابت نہ ہو سکے گی۔ علم کی پیمایش آسان ہے مگر جہل کی پیمایش نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کے علم کو اس کے جہل سے کیا مناسبت ہے۔ یہ سب کچھ صرف ان علوم کی بابت ہے جو مادیات و مشاہدات و تجربات سے متعلق ہیں۔ روحانیات اور امور فوق المادۃ و مابعد الطبیعات میں یورپ کی موجودہ معلومات کو ہم بلا خوف تردید بمنزلہ صفر کے قرار دے سکتے ہیں۔ جبکہ کائنات کے متعلق جو کہ انسان کی جولانگاہ ہے اور انسان کے متعلق جو کہ اس زمین پر حق تعالےٰ کا خلیفہ ہے یورپ کا علم اس قدر کم اور جہل اس قدر زیادہ ہے تو مستقل انسانی نصب العین کے متعلق یورپ کیونکر کوئی فیصلہ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ حقائق اشیاء اور حقائق انسانی کے کما حقہٗ انکشاف سے قبل کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بے بضاعتی اور کوتاہ علمی کے باوجود محض اپنے نت نئے خیالات خام کی بناء پر انسان جیسی اہم ہستی کے لئے اپنی طرف سے کوئی نصب العین قرار دیدے۔ اور اپنے تلوّن کے تحت میں آئے دن اسے بدلتا رہے ؎

قطع نظر امور مندرجہ بالا کے انسان اللہ تعالےٰ کا خلیفہ ہے خلیفہ خود مختار نہیں ہوتا بلکہ جس نے خلافت عطا فرمائی ہے اس کے ماتحت ہوتا ہے وہ اپنے لئے کسی دستور العمل کے قرار دینے یا نصب العین کے متعین کرنے کا کیونکر حجاز ہو سکتا ہے؟ اس کے لئے نصب العین تو وہی مقرر کر سکتا ہے جو اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا رب، اس کا ہادی ہے جس نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا اور حق خلافت ادا کرنے کی اسے استعداد بخشی انسان کا فرض ہے کہ کلام الٰہی سے دریافت کرے کہ حق تعالےٰ نے انسان کے لئے کیا نصب العین مقرر فرمایا ہے، پھر اسکا فرض ہے کہ احکام الٰہی کے مطابق اپنی زندگی اپنے خیالات اپنی امنگوں اور اپنی روش کو ڈھالے نہ یہ کہ اپنی دماغی روشنی سے ہدایت الٰہی کے انوار کو دھندلا کرنے کی کوشش ناکام میں مصروف رہے قرآن "نعوذ باللہ" بازیچہ اطفال نہیں کہ یورپ اپنی طفلانہ جدت پسندی کے شوق میں آئے دن نئے نئے نصب العین قرار دے اور تغیر پسندی کے ذوق میں مطالب قرآنی کو حسب دلخواہ الٹتا پلٹتا رہے۔ غلام کا یہ کام نہیں کہ اپنے لئے خود خدمت تجویز کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ اپنے آقا کے اشارہ پر چلے۔

قرآن کلام الٰہی ہے کلام مجموعہ ہوتا ہے الفاظ و معانی کا اگرچہ قرآن میں الفاظ و معانی کے ماوراء کچھ اور بھی ہے مگر اس موقعہ پر ہمیں صرف الفاظ و معانی ہی سے بحث ہے وحی کے ذریعہ جس طرح الفاظ قرآنی رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم پر نازل ہوئے اسی طرح ان الفاظ کے صحیح معنی بھی حضور سرور کائنات کے قلب پر وارد ہوئے (مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے مضمون "القاء۔ الہام۔ وحی" جو اسی اشاعت میں دوسری جگہ شائع ہو رہا ہے) ان معانی سے ہٹ کر الفاظ قرآنی کی کوئی جدید تفسیر (خواہ وہ تفسیر مشرقیوں نے کی ہو یا مغربیوں نے، علماء مصر و شام نے کی ہو یا محققین جرمنی نے) کلام الٰہی کی صحیح تفسیر

نہ ہوگی بلکہ ان لوگوں کی اپنی دماغی و ذہنی کیفیات کی تفسیر ہوگی قرآن کو صحیح معنی سے ہٹا دینے کی کوشش تحریف کی کوشش ہے جس میں کسی کو کامیابی نہیں ہو سکتی

اس میں شک نہیں کہ ابتدائے کائنات سے لیکر اس وقت تک انسانی دماغ پر مختلف ارتقائی دور گذرے اور دماغی صلاحیت بتدریج ترقی کرتی چلی آئی مگر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ترقی اپنے انتہائی نقطہ پر اب سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل پہنچ چکی۔ اب جو کچھ نظر آرہا ہے اور اس زمانے میں فہم و ادراک کی جو نمایش ہو رہی ہے اور سیرت و عمل کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے وہ اسی انتہائی دورِ ترقی کی ایک انحطاطی اور نزولی کیفیت ہے۔

انسانی ترقی کے ہر دور میں پیغمبر مبعوث ہوئے جنہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کی استعداد کو ملحوظ رکھ کر مناسب وقت تعلیم دی وہ تعلیم چند افراد و اقوام تک محدود اور وقت معین تک مخصوص رہی۔ ارتقائی تغیرات کی مناسبت سے تعلیم میں فروعی تغیرات پیدا ہوتے گئے۔ ان مناسب وقت تغیرات کو عمل میں لانے کی غرض سے ہر ملک اور ہر زبان میں نئے نئے پیغمبر مبعوث ہوتے رہے حتیٰ کہ حکمت الٰہی کے تحت میں یہ ترقی جب اپنے عروج کے انتہائی نقطہ پر پہنچی تو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے جو ہادی کافۃ الناس تھے جن کی تعلیمات جملہ انبیاء ماقبل کی تعلیمات پر مشتمل تھیں جن کا دین جملہ ادیان سابقہ کا ناسخ قرار پایا، جن پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ اب قیامت تک کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور جن پر وہ قرآن نازل فرمایا گیا جس کی حفاظت کا حق تعالےٰ نے خود ذمہ اٹھایا اور جس میں اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کی مہر لگا دی گئی۔ دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ اور قیامت تک اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ و تغیر و تبدل کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

کوئی عقلمند شخص اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ افضل الناس سید البشر امام انبیاء خاتم المرسلین محبوب حق محمد مصطفےٰ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم۔ جن پر قرآن نازل ہوا (نعوذ باللہ) قرآن کے معنی صحیح طور پر نہ سمجھ سکے یا اصحاب رسول جن کو رسول خدا نے خود بہ نفس نفیس قرآن کی تعلیم دی مفہوم قرآن سے صحیح طور پر آگاہ نہ ہو سکے۔ اور اب ساڑھے تیرہ سو برس بعد وہ جرمنی جن کی غلطی کی بدولت دنیا کا بڑا حصہ ایک عالمگیر جنگ کی سخت تباہ کن آگ میں بقول یورپ ہی کے حال میں کود چکا ہے۔ جو اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں اور بقول بیرن عمر کے اپنی حیات میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے۔ اور زندگی کے جدید اصولوں کی تلاش میں ہے یعنی بہ الفاظ دیگر وہ جرمنی جس نے ابتک ایک ناکام اور نامراد زندگی بسر کی ہے قرآنی تعلیم کا صحیح مفہوم از سر نو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا!

بیرن عمر کا خیال ہے کہ "مشرقیوں نے اب تک قرآن کو جس طور سے سمجھا ہے جرمنی اس سے بالکل مختلف طور پر فیضیاب ہوگا" مگر یہ خیال بجز اسکے کہ مغربی شیخی بازی کا ایک نمونہ ہو کسی اور اہمیت کا مستحق نہیں حقائق منقلب نہیں ہوتے۔ دین شاعری نہیں جس میں مشرق و مغرب کے طبائع کا اختلاف موثر ہو جس طرح ریاضی اور ریاضی کے نتائج سائنٹفک معلومات اور اسکے حاصل میں مشرقی و مغربی طبائع کے اختلاف کو دخل نہیں جس طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ دونوں کے نزدیک آگ جلانے والی اور پانی آگ بجھانے والا ثابت ہے اسی طرح مشرقی اور مغربی دونوں کے نزدیک حقائق الٰہی و حقائق کونی یکساں ہوں گے۔ خواہ دونوں کے تخیل اصول تجسس طرز استدلال اور روش زندگی میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ کیا جرمنی قرآن مجید کے ساتھ بھی وہ سلوک کرنا چاہتا ہے جو عیسائی دنیا نے بائبل کے ساتھ کیا؟ لیکن ہم پیشین گوئی کئے دیتے ہیں کہ خواہ جرمنی کے باشندے ہوں یا کہیں اور کے،

اس کوشش میں کسی کو بھی کامیابی نہ ہوگی۔ کیونکہ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ کی ضمانت قرآن کے الفاظ و معانی دونوں پر شامل ہے۔ نہ لفظی تحریف میں کسی کو کامیابی ہوگی نہ معنوی تحریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیشین گوئی فرما چکے ہیں کہ لَا یَزَالُ طَائِفَۃٌ مِنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْحَقِّ ظَاھِرِیْنَ لَا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَالَفَھُمْ حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ (میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ کھلم کھلا حق پر رہیگا۔ ان لوگوں کا مخالف ان کو ضرر نہ پہنچا سکے گا۔ یہاں تک کہ آجاوے امر اللہ کا یعنی قیامت)۔

اسلامی رواداری کے ثبوت میں بیرن صاحب دوسرے پیغمبروں پر ایمان لانے کے متعلق اسلامی ہدایات کو جو پیش کرتے ہیں، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ شاید اسلامی رواداری کے صحیح مفہوم سے ابھی تک آگاہ نہیں ہوئے تقریر مندرجہ بالا میں انگریزی لفظ (TOLERATION) کا ترجمہ "رواداری" کیا گیا ہے۔ کسی خلاف طبع امر یا مخالف چیز کی برداشت کو (TOLERATION) کہتے ہیں۔ دیگر انبیاء کا وجود اور ان کی تعلیمات نہ اسلام کے مخالف ہیں نہ طبائع اسلامی کے خلاف۔ موافق چیزوں کے ساتھ موافقت کو (TOLERATION) نہیں کہتے۔

اس سلسلہ میں ایک اور امر بھی قابل لحاظ ہے۔ دیگر انبیاء پر ایمان لانے کے یہ معنی نہیں کہ جو غلط تعلیمات ان انبیاء سے غلط طور پر منسوب کر دی گئی ہیں ان کو بھی مان لیا جائے۔ مثلاً ہر مسلمان عیسٰی علیہ السلام کو نبی برحق مانتا ہے۔ مگر کوئی مسلمان تثلیث کو تسلیم کرنے، اور اہل تثلیث کو اہل حق کہنے، اور تثلیث کی تعلیم کو عیسٰی علیہ السلام سے منسوب کرنے کے لئے از روئے اسلام آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اسلامی رواداری کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق کہہ دیا جائے۔ مومن کو کافر اور کافر کو مومن سمجھ لیا جائے۔ صالح اور فاسق میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ایک بالکل دوسری چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صراط المستقیم وہی ہے جس کی

تعلیم قرآن پاک میں فرمائی گئی ہے۔ ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ ہمارے سب دوست ہمائے ہموطن ہماری اس دنیا کے سب رہنے بسنے والے اس صراط المستقیم پر چلیں اور فائدہ اٹھائیں۔ اس دنیا میں بھی سرسبز ہوں اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں۔ ہم ہر ممکن تدبیر اور کوشش کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ کہ ایسا ہو اور سب ایک ہو جائیں مگر باوجود ان تمام جائز خواہشات کے ہم کسی کو بجبر مسلمان کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جبر و خوف کے تحت مسلمان بن جانے سے کوئی سچا مسلمان نہیں بن سکتا۔ اور جب تک کوئی دل سے اور برضا و رغبت اسلام قبول نہ کرے آخرت کے فوائد سے وہ محروم رہیگا۔ اغیار کو بجبر مسلمان نہ بنانے کے یہ معنی نہ سمجھ لئے جائیں کہ ادیانِ غیر از اسلام کی حقانیت کے بھی ہم نعوذ باللہ قائل ہیں۔

اس سے اگر کوئی نتیجہ نکالا بھی جا سکتا ہے۔ تو بس یہی کہ جرمنی ترقی کرتے کرتے اب اس منزل پر پہنچا ہے جس پر عرب صدیوں قبل پہنچ چکے تھے۔ طرزِ تعمیر اور فرنیچر وغیرہ میں تو صدیوں قبل کے عربوں سے مماثلت پر فخر کیا جاتا ہے۔ لیکن تفسیر قرآن کے باب میں ان عربوں سے گریز اور جدت کی تلاش کیا عجیب و غریب ذہنیت ہے!

ہم دیکھتے ہیں کہ دانشمندانِ یورپ ابھی تک اسی محدود دنیا کے چکر میں مقید ہیں۔ مذہب کو صرف دنیوی معیار ہی سے پرکھتے ہیں۔ اسلام کے صرف دنیوی مفاد ہی کو ٹٹولتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو ایک وسیع تر اور بالاتر میدان میں ترقی کے لئے پیدا کیا ہے۔ دنیوی مفاد تو محض ضمنی اور درمیانی اور عارضی چیزیں ہیں سچا مذہب انسان کی سفلی اور علوی دونوں ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ دونوں میدانوں میں ترقی کی شاہ راہ کو کھولتا ہے۔ دنیوی سرسبزی کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اور آخرت کی نجات کا سامان بھی مہیا کرتا ہے ان دونوں پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے دونوں میدانوں میں کامیابی حاصل کرنا انسان کا فرض ہے۔ یورپ ابھی تک صرف ایک ہی میدان میں ترقی کرنے کا خواہشمند

نظر آتا ہے۔ دوسرے میدانوں سے بالکل غافل ہے حالانکہ کامل ترقی وہی ہے جس میں ہر پہلو کا اس پہلو کی اہمیت کی مناسبت سے خیال رکھا جائے اگر انسان اپنے کسی ایک عضو کو نشو ونما دیتے دیتے بہت زیادہ قوی کرے مگر بقیہ اعضاء کو بیکار و معطل رکھکر بالکل بحس کمزور اور مردہ بنا دے تو عضو قوی کی قوت کے باوجود اس شخص کو کوئی پورا انسان بھی نہ کہیگا چہ جائے کہ ترقی یافتہ انسان اُسے سمجھے۔ یورپ کی ایک محدود دائرہ میں ترقی اس کے لئے کافی نہیں۔ کہ اسے صحیح معنوں میں ترقی یافتہ ——————— کہا جائے۔ یورپ کی ان شدید خامیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجود اپنی حیرت انگیز سائنٹیفک ترقیوں کے وہ دنیا میں امن وعاقبت و مسرتِ حقیقی پھیلانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کا بیرن عمر کو بھی اعتراف ہے۔ یورپ کی یہ خامیاں اسی صورت میں دور ہو سکتی ہیں۔ جبکہ یورپ قرآن مجید کو اسی طور پر سمجھنے کی کوشش کرے جس طور پر اصحاب رسول نے اسے سمجھا اور قرآن پر اس طریقہ سے عمل کرے جس طریقہ سے اس برگزیدہ جماعت نے اس پر عمل کیا۔ اگر یورپ نے بہت جلد ایسا نہ کیا اور اپنے ہی جہل مرکب پر اڑا رہا تو نتیجہ جو کچھ ہوگا وہ ارباب عقل و فہم پر ظاہر ہے +

تصوّف اسلام ڈاکٹر نکلسن کی نگاہ میں

وی لیگیسی آف اسلام (The Legacy of Islam) یعنی "ورثہ اسلامیہ" مؤلفہ سر ٹامس آرنلڈ (آنجہانی) اور مسٹر الفریڈ گیلوم (Alfred Guillaume) ایک حال کی تالیف ہے۔ جو انگلستان کے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے حال میں شائع ہوئی ہے اس کتاب میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر یورپین نگاہ سے نظر ڈالی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اسلام کا یورپ پر کیا اثر پڑا۔ مختلف ابواب مختلف مستشرقین یورپ کے قلم سے نکلے ہیں۔ جس شخص کو جس مضمون کے ساتھ زیادہ مناسبت تھی۔ اُس نے اسی مضمون پر قلم اٹھایا اور مؤلفین نے ان مضامین کو کتاب کی صورت میں ترتیب دیکر ایک دیباچہ کا اضافہ کر دیا۔ اس کتاب میں "تصوف" پر بھی ایک باب ہے جو مسٹر آر۔ اے۔ نکلسن کا لکھا ہوا ہے۔ مسٹر نکلسن کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں اور فارسی و عربی میں اتنی استعداد رکھتے ہیں کہ تصوف کی کتابوں کا بخوبی مطالعہ کر سکیں چنانچہ ان کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن میں ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اور انہوں نے مسائل تصوف کے سمجھنے میں اپنی دماغی قابلیت کو بھی پوری قوت سے صرف کر دیا ہے مگر تصوف ان چیزوں میں سے نہیں جو محض مطالعہ کتب سے سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ جب تک روحانیت سے کسی شخص میں فطری مناسبت نہ ہو اور تصوف کے عملی پہلو سے وہ کیفی اور جذبی آگاہی حاصل نہ کرے اس فن لطیف کی باریکیاں کما حقہٗ اس کی سمجھ میں نہیں

ہو سکتیں۔

اسلامی مسائل پر مستشرقین یورپ کی بیشتر تحریریں دیکھنے کے بعد مندرجہ ذیل نتائج میں سے کسی ایک نتیجہ پر لازمی طور پر آنا پڑتا ہے۔

(۱) باوجود علم و فضل کے لمبے چوڑے دعووں کے ان لوگوں میں اب تک صحیح اسلام کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔

(۲) یا یہ لوگ دیدہ و دانستہ اسلام کو بدنما بنا کر پبلک کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۳) یا پھر ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ لوگ اسلام کا مطالعہ تحقیق حق کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ جاسوس بن کر دشمنی کی نگاہ اس پر ڈالتے ہیں۔ اور اسے توڑ موڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

یہ لوگ غلط مبادیات سے ابتدا کرتے ہیں اور غلط نتائج پر آتے ہیں۔ اسلام کو غلط معیار سے پرکھتے ہیں اور خود اپنی ہی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں جس نگاہ سے وہ فلسفہ کو دیکھنے کے عادی ہیں اسی نگاہ سے مذہب کو بھی دیکھتے ہیں حالانکہ فلسفہ اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں فلسفہ کوشش انسانی کا نتیجہ ہے۔ مذہب حق تعالےٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت ہے۔ محدود انسانی معلومات، ناقص انسانی تجربوں، کوتاہ نظر ضعیف البصر اور خام عقل کے تنگ و تاریک اور ناہموار میدان میں استدلال کے پائے چوبین کی گردشوں پر فلسفہ کے وجود کا انحصار ہے۔ اور وحی الٰہی کی ہدایت بخش روشنی پر مذہب کا دار و مدار ہے دونوں چیزیں مختلف برتاؤ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مگر جس قوم نے وحی الٰہی ہی کو ابھی تک نہ سمجھا ہو اور جس کی علمی روشنی خالق و مخلوق کے صحیح تعلقات باہمی کی جانب رہنمائی کرنے میں ظلمت کا حکم رکھتی ہو اس قوم کے افراد اپنی ہی روش پر قائم رہ کر ایک سچے مذہب کے متعلق صحیح اصول

پر کامیابی کے ساتھ تحقیقات نہیں کر سکتے۔ فِی قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

ایک بڑی غلطی جس میں یہ لوگ اکثر الجھا کرتے ہیں یہ ہے کہ اسلام کو وہ ایک جدید مذہب سمجھتے ہیں اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مذہب کا بانی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ اجمالاً اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اسلام نہایت قدیم مذہب ہے۔ جس مذہب کی اشاعت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیا علیہم السلام نے کی وہ اسلام ہے اور اسی مذہب کی اشاعت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی کی۔ از آدم تا این دم جملہ انبیا علیہم السلام کی تعلیمات میں اصولاً کوئی اختلاف نہیں۔ صرف فروعی اختلافات ہیں۔ جو ضرورت وقت اور مصلحت الٰہی پر مبنی ہیں۔ عقاید اصول کے تحت میں آتے ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ انبیاء مرسلین حق کی تعلیمات کے اثرات سے نہ حکمائے یونان محروم رہے نہ رہبان عیسوی، نہ جوگیان ہند۔ اس حقیقت سے دیگر اقوام کے محققین بھی نا آشنا نہیں۔ چنانچہ الفریڈ ویبر اپنی کتاب تاریخ فلسفہ کے صفحہ ۱۶۴-۱۶۵ پر لکھتے ہیں کہ:-

"وسیع الخیال اصحاب غور و فکر مثلاً ماڈریٹس (Moderatus) نکومیکس Numenius اور نیوسینیکا Nicho macus موسیٰ علیہ السلام کو یہودی افلاطون اور افلاطون کو یونانی موسیٰ کہنا پسند کرتے تھے۔"

پھر صفحہ ۱۸۶ پر وہ لکھتے ہیں کہ:-

"کوئی شخص افلاطون اور عیسائیت میں بعض مماثلتوں کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان مماثلتوں میں سے بعض اتنی قریبی اور ملتی جلتی ہیں کہ ان میں ذرا سا بھی اختلاف نظر نہیں آتا۔ ان مماثلتوں کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے جو بکثرت محققین پختگی سے اس امر پر متفق ہیں کہ افلاطون کا ماخذ عبارات کتب عہد عتیق ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں نے حق میں اپنی طرف سے باطل کی بھی آمیزش کر لی، یقینیات میں ظنیات کو شامل کر لیا۔ سچی تعلیمات کی اصلی صورت کو اپنی غلطیوں سے بگاڑ دیا۔ حق کو باطل کی آمیزشوں سے دور کرنے ہی کے لئے اور اصلی تعلیمات کی تکمیل کی غرض سے ہمارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں اور فرقہائے سلف کے افعال واقوال میں کہیں کہیں صوری مشابہت یا معنوی مماثلت نظر آجائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ اسلام میں کوئی غیر اسلامی چیز بھی آکر شامل ہوئی ہے۔ حق بات کہیں بھی ہو مومن کی ملکیت ہے۔ کیونکہ وہ حق تعالےٰ کی طرف سے ہے۔ پروفیسر نکلسن اپنے مضمون میں جابجا اپنی قیاسی کھینچ تان سے جو یہ بیان کرتے چلے گئے ہیں کہ مسلمان صوفیا نے فلاں زمانے میں خیال فلاں گروہ سے اخذ کیا یہ ان کی نادانی سادہ لوحی، اور یورپین ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ کی طرح مذہب بھی امتداد زمانہ سے اپنے متبعین کی قابلیت اور تجربوں کے ساتھ اپنی صفات ذاتی میں ترقی کرتا چلا آتا ہے۔

ایک اور بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر پیغمبر اپنے زمانے میں اپنی امت کو تعلیم اس طریقہ سے دیتا ہے جسے آجکل انگریزی اصطلاح میں ڈائرکٹ میتھڈ (Direct Method) کہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نبی نے خود وضو کر کے بتلا دیا کہ وضو اس طرح کرتے ہیں۔ نماز پڑھ کر بتلا دی کہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ لوگ ان باتوں کو بہت آسانی سے حاصل کرتے ہیں اور اس حصول میں انہیں نہ کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت پڑتی ہے نہ وہ اصطلاحات کے محتاج ہوتے ہیں۔ مگر بعد کے زمانوں میں ان امور کی وضاحت کے لئے اصطلاحات وضع کرنے کی بھی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کتابوں کے لکھنے کی بھی۔ زمانہ جس قدر قرن اول سے بعد اختیار کرتا جاتا ہے۔ اسی قدر اصطلاحات اور تصانیف میں وضاحت کی بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ پہلے زبان وجود میں آتی ہے بعد میں اس کی صرف ونحو لکھی جاتی ہے۔ اور تصانیف طلبا کی قابلیت کے لحاظ سے مختلف انداز سے بیان کی جاتی ہے

یہی سبب ہے کہ عموماً متقدمین کی تصانیف تصوف میں اجمال اور متاخرین کی تصانیف میں تفصیل پائی جاتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کچھ متاخرین نے لکھا ہے وہ اصل چیز میں اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے۔ بلکہ ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق اپنے زمانے کے لوگوں کی ذہنیت اور استعداد کو مدنظر رکھ کر اصلی چیز ہی کو جس وضاحت اور صفائی اور عمدگی سے ہو سکتا ہے۔ بیان کرتا ہے۔ امام غزالیؒ نے اگر تصوف کو اس انداز سے بیان کیا کہ جو لوگ پہلے اس سے منحرف تھے۔ اور اس کے دلدادہ ہو گئے تو یہ امام غزالیؒ کے انداز بیان کی خوبی ہے۔ نہ یہ کہ انہوں نے نعوذ باللہ اپنی طرف سے تصوف یا اسلام کی صورت کو بدل دیا ہو۔ قرآن شریف کی کتابت میں پہلے اعراب نہ دیئے جاتے تھے۔ بعد میں ضرورت مقتضی ہوئی کہ اعراب دیئے جائیں۔ اس سے اگر کوئی یورپ والا یہ نتیجہ نکالے کہ قرآن میں زیر زبر پیش کا بعد میں اضافہ ہوا تو یہ بات اس کی انتہا درجہ کی نادانی پر دلالت کرے گی۔ افسوس ہے کہ اس قسم کی لغزشیں پروفیسر نکلسن سے بھی سرزد ہوئی ہیں۔

اس کتاب کا نام "ورثہ اسلامیہ" بھی اہل یورپ کی اسلام کے متعلق ذہنیت کا پتہ دیتا ہے الحمد للہ کہ اسلام مردہ نہیں کوئی مسلمان اس کتاب کو لکھتا تو اس کا نام

"زندہ اسلام کے زندہ اثرات"

رکھتا اور وہ کتاب بفضلہ تعالےٰ ان عیوب سے بھی پاک ہوتی جو اس انگریزی کتاب میں پائے جاتے ہیں۔ کاش کوئی صاحب اس کا ترجمہ کر کے حواشی ہی کے ذریعہ سے ان عیوب کو دور کر دیں۔

تصوّف

زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ میں انڈرہل کی کتاب مسٹسزم (MYSTICISM) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اس کے ابتدائی صفحات پر میری نظر سے دو مقولے گزرے۔ ایک تو جرمنی کے زمانہ وسطیٰ کے ایک روحانی شخص کا تھا اور دوسرا انگلستان کے ایک مصنف جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ ان مقولوں کو دیکھ کر مجھے معاً یہ خیال گذرا کہ میں ان دونوں سے ملتے جلتے مسلمانوں کے مقولے بھی پیش کر سکتا ہوں[1]۔ ایکہارٹ (جرمنی) کا مقولہ یہ ہے کہ:۔ "مخلوق جو کہ نیستی محض ہے انا کے استعمال کی مجاز نہیں اور یہ لفظ صرف خدا ہی استعمال کر سکتا ہے"۔ اس مقولہ نے میرے دل میں اس یاد کو تازہ کر دیا کہ ساڑھے تین سو سال قبل بغداد میں ابو النصر سراج نے توحید کی تعریف کے سلسلہ میں بیان کیا تھا کہ "سوائے خدا کے کسی کی مجال نہیں کہ انا کہے کیونکہ انائے حقیقی خدا ہی کو سزاوار ہے"۔ اور ایڈورڈ کارپینٹر (انگلستان) کا مقولہ یہ ہے کہ:۔ "اس مشاہدہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جملہ حواس ملکر ایک حس بنگئی"۔ اس مقولہ نے میری رہنمائی مصر کے شاعر اور ولی ابن الفارض (۱۲۳۵ء) کے ان اشعار کی جانب کی جن کا مطلب یہ ہے کہ:۔ "میری آنکھ بولتی تھی اور میری زبان دیکھتی تھی۔ میرے کان باتیں کرتے تھے۔ اور میرے ہاتھ سنتے تھے۔ جس وقت کہ میرا کان

---

[1] پروفیسر نکلسن نہ تو یہاں تصوف کی تعریف بیان کرتے ہیں۔ نہ کسی اور طریقہ سے سمجھاتے ہیں کہ تصوف کسے کہتے ہیں۔ ابتدا ہی سے ان کی نظر مختلف اقوام کے مقولوں کی مماثلتوں پر ہوتی ہے۔ اور انہیں مماثلتوں کو آگے چل کر وہ شہادتیں قرار دینے لگتے ہیں (ذوقی)

آنکھ بنا ہوا تھا اور سب کچھ دیکھتا تھا۔ میری آنکھ کان بنی ہوئی تھی۔ اور گیت سُن رہی تھی اس کا منشا یہ ہے کہ مشاہدۂ خاص میں اس کے تمام حواس متفق تھے۔ اور ایک ہی کام کر رہے تھے۔

یہ ایک توارد ہے جو بادی النظر میں شہادت کا حکم رکھتا ہے کیفیات روحانی اور بصیرت عرفانی میں مغرب اب بھی اسلام سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔ ازمنہ متوسط میں جب کہ مسلمانوں کے فلسفہ اور علوم کی شعاعیں ان کے اندلسی مرکز سے نکل کر عیسوی یورپ پر پڑ رہی تھیں اور وہاں روشنی پھیلا رہی تھیں یورپ نے جو کچھ مسلمانوں سے سیکھا اور حاصل کیا اس کی تفصیل ابھی تک دریافت طلب ہے مگر اس میں شک نہیں کہ سیکھا بہت کچھ۔ حیرت کی بات ہوگی اگر اسلامی تصوف کے اثر سے ٹامس ایکوئناس، ایکہارٹ، اور ڈانٹے جیسے لوگ بچے ہوں۔ کیونکہ تصوف کی مشترکہ زمانہ وسطیٰ میں عیسویت اور اسلام باہم بہت متصل تھے۔ یہ واقعہ تاریخ پر مبنی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس سے اس امر کا پتہ چل جائیگا کہ اس زمانہ کے رومن کیتھولک اور مسلمان ارباب روحانیت کے خیالات اور طریقوں میں اس درجہ مماثلت ہے کہ دونوں ایک ہی سی روحانی ذہنیت کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ کیتھولک چرچ نے تو اپنی ان روایات کو قائم رکھا۔ مگر تیرھویں صدی عیسوی کے بعد اسلام میں روحانیت نے اس مذہب جدید کے فلسفہ کی جانب رُخ کیا جو متشرع لوگوں کی نگاہ میں مذہب حقیقی سے بالکل مختلف ہے۔

دوسری صدی ہجری کے اختتام کے قریب (۷۱۹-۸۱۶ء) ہم کو عراق میں لفظ صوفی سے سابقہ پڑتا ہے جس نام سے کہ بعد میں روحانی مسلمان پہچانے جانے لگے۔ اس کا صوف سے مشتق ہونا جو کہ عیسائی راہبوں کا لباس تھا منجملہ اُن علامات کے ہے جو کہ اس جانب رہنمائی کرتی ہیں۔ ماخذ کے مشکل سوال پر یہاں بحث نہیں ہو سکتی۔ ہم پہلے اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ تصوف کی اصل اسلام

ہے۔ صوفیوں کا یہ دعوےٰ کہ انہوں نے تصوف کو پیغمبر سے اخذ کیا قابل وقعت ہے۔ قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو پیغمبر کی شخصیت کے متعلق صحیح حالات لے کر ہم تک پہنچی ہے۔ اور اس میں رہبانیت اور اسرار مذہب کے عناصر دیگر عناصر کے ساتھ مخلوط ہیں۔ رہبانیت کے عناصر پر صوفیا نے پیغمبر صاحب سے بھی زیادہ زور دیا ہے۔ اور زیادہ گہرے معنی پہنائے ہیں۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تصوف نے قرآن سے کچھ نہیں لیا۔ مسلمان جو کہ اپنی کتاب مقدس کا ہمیشہ سے بڑا احترام کرتے چلے آئے ہیں اور بچپن ہی میں اسے حفظ کر لیتے ہیں۔ اور بڑے غور و خوض سے اس کی تلاوت کرتے ہیں اور تمام انسانی علوم کے حصول کی اسے کنجی سمجھتے ہیں، اس خیال کی کسی طرح تائید نہیں کر سکتے اور تاریخی اعتبار سے یہ بات ہے بھی غلط۔ گو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے الٰہیات کے متعلق اصولاً ظاہری یا باطنی تعلیم باقاعدہ اور واضح طور پر نہیں دی[1] قرآن میں دونوں کے لئے (یعنی ظاہری اور باطنی تعلیم کے لئے) خام مسالہ موجود ہے۔ خدا کے متعلق پیغمبر صاحب کے بیانات بیشتر جذبات اور کمتر غور و خوض کا نتیجہ ہیں۔ اور ان بیانات میں بظاہر کوئی صوری تطبیق نہیں[2]۔ متکلمین اسلام نے اپنے عقائد میں اللہ تعالےٰ کے رفیع الدرجات اور برتر ہونے کو داخل کیا مگر صوفیا نے اتباع رسول میں اپنے عقائد میں اللہ کے رفیع الدرجات اور برتر ہونے کے ساتھ اس کے جاری اور ساری (حاضر و ناظر) ہونے

---

[1] برین عقل و دانش بباید گریست۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الٰہیات کے متعلق جتنی اچھی اور جتنی مکمل تعلیم دی ہے اس سے بہتر نہ کسی اور نے دی نہ کوئی اور دے سکتا ہے۔ (ذوقی)

[2] خدا کے متعلق نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بیانات نہ جذبات پر مبنی ہیں۔ نہ غور و خوض پر بلکہ وحی الٰہی کا نتیجہ ہیں۔ جو کہ سائنٹیفک تحقیقات سے ماوراء ہے بیانات مذکورہ میں اہل حجاب کے نزدیک باہم تطبیق صوری کا بظاہر نہ ہونا کوئی نتیجہ بخش امر نہیں اللہ تعالےٰ جامع اضداد ہے اور اسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا جس نگاہ سے ایک انسان کو دیکھا جاتا ہے۔ وہ لامحدود ہے اور جملہ اقسام کے تقیدات سے پاک۔ ذوقی۔

کو بھی شامل کر لیا اور گو موخر الذکر امر کی جانب قرآن میں اشارات ہیں مگر وہ اشارات اس درجہ واضح اور نمایاں نہیں جتنا کہ صوفی انہیں واضح اور نمایاں اور اہم قرار دیتے ہیں۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا (النور ع ۱)
هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ	وہی اول۔ وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن (الحدید ع ۱)
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ	نہیں ہے کوئی الٰہ مگر ہر چیز ہالک ہے مگر ذات اس کی (القصص۔ ع ۹)
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ۔	اور پھونک دی بیچ اسکے روح اپنی (الحجر۔ ع ۳)
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ	اور البتہ تحقیق پیدا کیا ہم نے انسان کو اور ہم جانتے
مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ	ہیں جو کچھ کہ خطرہ اسکے دل میں گزرتا ہے۔ ہم انسان
اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق۔ ع)	سے اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔
فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ	پس جس طرف تم منہ کرو وہیں اللہ کا منہ ہے (البقر ع ۱۴)
وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ	اور جس کو اللہ نور نہ عطا فرمائے اس کے لئے کہیں
مِنْ نُّوْرٍ۔	نور نہیں (النور ع ۵)

آیات مندرجہ بالا میں تخمہائے تصوف یقیناً موجود ہیں اور صوفیائے متقدمین کے لئے قرآن صرف خدا کا کلام ہی نہیں بلکہ خدا سے قرب حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ بھی ہے۔ کثرت عبادت اور قرآن پر بالعموم بہیئت مجموعی اور بالخصوص سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور سورہ النجم کی پہلی اٹھارہ پر اسرار آیات جو کہ معراج سے متعلق ہیں غور و خوض کرنے اور مراقب رہنے سے اُن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مشاہدات کو خود حاصل کرنے کی کوششیں کی ہیں۔

اب زمانی اور مکانی حالات پر بھی ذرا نظر ڈال دیکھو جس سیاسی انقلاب نے دار السلطنت کو

دمشق سے بغداد کی طرف منتقل کیا۔ اس نے اسلام کو ایک قدیم تر تمدن سے بھی متصل اور متصادم کر دیا اور گو بالآخر اسلامی غلبہ نے اجنبی خیالات کو مٹا دیا مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس نوعیت کے مقابلوں میں غلبۂ کامل کبھی نہیں حاصل ہوتا۔ ہمارے زیر بحث اس وقت وہ عالمگیر تحریک ہے جو اُن ممالک میں پھیل گئی تھی۔ جہاں مسلمان مذہبی مباحثوں اور مناظروں میں عیسائیوں اور زرتشتیوں وغیرہ کے ساتھ رات دن مصروف رہتے تھے۔ اور جہاں محکوم قومیں جو کہ نو مسلم تھیں اپنے جدید اختیار کردہ مذہب کو اپنی ضروریات کے مطابق بنانے کی کوشش میں بعض مرتبہ صدق دلی کے ساتھ اپنی پرانی محبوب باتوں اور رسموں کی تائید میں تعلیم رسالت سے مصالحہ فراہم کر لیتی تھیں۔ صوفیوں کو قرآن کے باطنی پہلوؤں کا مطالعہ کنندہ تسلیم کرنا درست ہے۔ مگر میرے خیال میں تصوف کو محض قرآن ہی کی تعلیم کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں۔ ۱۰۰۰ء کے بعد تصوف نے یونانی فلسفہ کو کرنا شروع کر دیا۔ اور اب تک جو تاریخی شہادت مہیا ہو سکی ہے۔ اس سے اسی جانب اشارہ پایا جاتا ہے کہ تصوف کا ماخذ اور اس کی ابتدائی نشو و نما عیسائی رہبان اور یونانی باطنیوں کے اثرات سے متعلق ہے۔ ہم اچھی طرح یقین کر سکتے ہیں کہ عیسائی راہب کی شکل و صورت سے محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) خوب آشنا ہونگے۔ اور اس شکل و صورت نے آپ کے متبعین کے لئے ایک نمونہ پیش کیا ہوگا۔ جس کے مطابق وہ لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہوں گے[1] یہ مشہور کلمات کہ لا رہبانیۃ فی الاسلام جو کہ آپ سے منسوب کر دیئے گئے ہیں درحقیقت زمانۂ مابعد کا ایک انحراف ہے جو عیسائی تخیل کے خلاف کیا گیا ہے۔ اور عیسائی اثرات کے اس وقت کے غلبہ کا ایک ثبوت ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبر صاحب نے

---

[1] "ہوگا" اور "ہونگے" کے الفاظ پر ذرا غور کیجئے اور ان ظنیات کی بنا پر پروفیسر صاحب کے استدلال کو ملاحظہ فرمایئے۔ (ذوقی)

قرآن میں رہبانیت کو جس میں کہ ترک دنیا بھی شامل ہے، منع فرمایا ہے مگر سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۰ کی تفسیر جو کہ تیسری صدی ہجری کے آخر تک تسلیم کی گئی ہے، یہ ہے کہ آپنے رہبانیت کا حکم اس حیثیت سے فرمایا کہ وہ خدا کی مقررہ کردہ ہے اور مذمت کا مستحق انہی کو قرار دیا جنہوں نے اس کو بگاڑ دیا۔[1]

ابتدائی زمانہ کا اسلامی تصوف آنے والے عذاب الیم کی دہشت اور خوف، روزے اور گریہ زہد اور تقویٰ اور مناجاتوں کا ایک آتش خانہ تھا جس میں اس تصوف کی پرورش ہوتی تھی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے ہوتے ہوئے خدا کی عبادت، دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے کرنا چونکہ خدا کے ساتھ ایک اور معبود کو شامل کر لینا ہے یعنی غیر اللہ سے محبت یا خوف کو دل میں جگہ دے لینا ہے اس لئے صوفی صرف خدا ہی پر بھروسہ کرتا ہے جسے توکل کہتے ہیں اور خدا ہی کی رضامندی سے خوش ہوتا ہے جسے رضا کہتے ہیں۔ مگر یہ قول فیصل نہیں۔ معبودان (باطل) سے علیحدگی کا لازمی نتیجہ معبود برحق سے کامل لگاؤ ہے۔ اور تصوف کی زبان میں اس کامل لگاؤ کو واصل حق ہونا کہتے ہیں۔

---

[1] یہاں تو پروفیسر صاحب نے غضب ہی کر دیا، اول تو قرآن میں جو احکام آئے ہیں وہ پیغمبر صاحب کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہیں۔ دوسرے جس آیت کی رو سے رہبانیت کو پروفیسر صاحب حکم الٰہی کے مطابق قرار دیتے ہیں یہ ہے

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ - (الحدید ع ۴)

اور رہبانیت انہوں نے (یعنی نصاریٰ نے) اپنی طرف سے نکالی تھی ہم نے اسے ان پر نہ لکھا تھا (یعنی ہم نے انہیں اسکا حکم نہ دیا تھا۔ مگر جب انہوں نے خود اسے) اللہ کی رضامندی کی تلاش میں (اختیار کیا تھا تو احکام حق ادا کرنے کی رعایت ملحوظ رکھنی چاہیئے تھی مگر) انہوں نے رعایت نہ کی اس کی جیسا کہ حق تھا رعایت کرنے کا پس دیا ہم نے ان لوگوں کو کہ ایمان لائے ان میں سے ثواب ان کا اور بہت ان میں سے فاسق ہیں۔

اس آیت سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رہبانیت کا حکم خدا کی طرف سے نہ تھا۔ بلکہ ایک بدعت تھی جو کہ خود نصاریٰ نے ایجاد کی تھی اور پھر بھی اس کا حق ادا نہ کر سکے۔ (باقی)

اور یہ دراصل عشق کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ بنیادی اُصول ہے جس پر سارے مذہبی اور اخلاقی تصوف کا دار و مدار ہے۔ ہمارے (یعنی یورپ کے مستند مصنفین نے اس خیال کو سب سے پہلے جن کے کلام میں وضاحت کے ساتھ اور نمایاں طور پر پایا ایک وہ ولیہ ہیں۔ جو رابعہ بصریہ کے نام سے موسوم ہیں۔ (۱۰۱ھ) وہ ایک لونڈی تھیں جن کے والدین کی بابت کوئی علم نہیں[1] معلوم نہیں کہ جو اشعار ان سے منسوب ہیں وہ اُن کے ہیں بھی یا نہیں۔ مگر ان اشعار میں ایک صوفی کا نصب العین ان قلبی کیفیات کو قرار دیا گیا ہے جو محبوب کے تصور سے دل میں برانگیختہ ہوتے ہیں۔ ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ:۔

"دو وجوہ ہیں جن سے مجھے تیری محبت ہے۔ ایک ذاتی وجہ اور دوسری وجہ یہ کہ تو مستحق ہے اس کا کہ تجھ سے محبت کی جائے۔ خود غرضانہ محبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ مگر میرا ہر خیال تیری محبت سے سرشار ہے۔"

سب سے زیادہ خاص محبت تو وہ ہے جس میں تو میری نگاہ پرستش کے سامنے نقاب اٹھا دے۔ اس میں میری کوئی تعریف ہے نہ اس میں بلکہ ہر بات میں قابل تعریف تو ہی ہے۔"[2]

---

[1] حضرت رابعہ بصریہ کے تفصیلی حالات اور کم سنی میں انکے والدین کے فوت ہو جانے کے واقعات حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے اپنی مشہور کتاب تذکرۃ اولیا میں درج فرمائے ہیں۔ (ذوقی)

[2] تعجب ہے کہ بقول پروفیسر نکلسن مصنفین یورپ کو یہ خیال سب سے پہلے حضرت رابعہ بصریہ رح کے کلام میں نظر آیا اور قرآن پاک کی اس آیت پر نگاہ نہ پڑی:۔ والذین امنوا اشد حبا للہ اور وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اللہ سے اشد درجہ کی محبت یعنی عشق رکھتے ہیں۔ اس آیت کی رو سے۔ ایمان کا دار و مدار ہی عشق الٰہی پر ہے۔ پھر یحبھم و یحبونہ اور قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اور اس نوعیت کی دیگر آیات کو نہ دیکھا اور محبت الٰہی کو اسلام میں بعد کی چیز کہدیا جن لوگوں کی قرآنی دانی کا یہ حال ہو انہیں اسلامی مسائل پر قلم اٹھانے کی جرأت کیونکر ہوتی ہے؟ (ذوقی)

یہ عقیدہ کہ وصول الی اللہ رحمت حق ہی پر موقوف ہے قرآن میں تو بہت کھینچ تان سے پایا جاتا ہے مگر مشکوک یا جعلی احادیث نبوی میں بہت زیادہ واضح ہے۔ مثلاً خدا فرماتا ہے میرا بندہ میرے قریب آتا ہے؟ افعال انیک سے اور میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں ہوتا ہوں اس کا کان تاکہ مجھ سے سُنے اور اس کی آنکھ تاکہ مجھ سے دیکھے اور اس کی زبان تاکہ میرے ذریعہ بات کرے اور اس کا ہاتھ تاکہ میرے ذریعہ گرفت کرے[1]

کثرت ذکر الٰہی سے صوفیا اپنے سلوک کو شروع کر کے معرفت تک پہنچتے ہیں اور معرفت کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ دل کی آنکھ سے مشاہدہ کر کے مراتب توحید کو معلوم کیا جائے۔ اس باطنی زندگی کی تشریح جو کہ تجربہ پر مبنی ہو سب سے پہلے بصرہ کے حارث محاسبی (۸۵۷ء) نے بیان کی۔ ان کی تصنیف رعایہ لحقوق اللہ جس کا ایک ہی قلمی نسخہ باقی ہے اور اکسفورڈ میں اب تک موجود ہے۔ نزاکت خیال اور جدت کا پتہ دیتا ہے۔ مگر اس میں موسوی اور عیسوی ماخذ سے بہت

---

[1] جس حدیث کی جانب یہاں اشارہ ہے اس کی صحیح عبارت حسب ذیل ہے:۔

ومایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ فکنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بھا ورجلہ التی یمشی بھا وان سالنی لاعطینہ ولئن استعاذنی لاعیذنہ (بخاری)

ترجمہ: اور ہمیشہ رہتا ہے بندہ میرا نزدیکی ڈھونڈھتا طرف میرے ساتھ نوافل کے یہاں تک کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو اور جس وقت کہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو میں ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی کہ سنتا ہے ساتھ اس کے اور بینائی اس کی کہ دیکھتا ہے ساتھ اس کے اور ہاتھ اس کا کہ پکڑتا ہے ساتھ اس کے اور پاؤں اس کا کہ چلتا ہے ساتھ اس کے اور اگر مانگتا ہے مجھ سے یہ بندہ البتہ دیتا ہوں میں اس کو اور اگر پناہ پکڑتا ہے ساتھ میرے البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو۔

نکلسن صاحب کے نزدیک یہ حدیث مشکوک یا جعلی ہو تو ہو۔ ان کے نزدیک تو نعوذ باللہ قرآن بھی مشکوک یا جعلی ہے۔ مگر مسلمانوں کے نزدیک یہ حدیث نہایت صحیح ہے۔

(ذوقی)

کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ بقول مصنفین مابعد طریقت مشتمل ہے۔ مقامات و احوال پر۔ پہلا مقام توبہ کا ہے۔ اس کے بعد اور مقامات کا سلسلہ آتا ہے مثلاً ترک، زہد، توکل ہر مقام آنے والے مقام کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ تفصیل میں اختلاف ہے مگر اجمال و عمومیت میں کوئی اختلاف نہیں۔ سالک کا سبق یہ ہوتا ہے کہ افعال قلب کا زیادہ خیال رکھے۔ بہ نسبت افعال جوارح کے نیت کو عمل کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دے، اور احکام شریعت کی تعمیل کرتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ ان احکام میں بالاتر حقائق کی جانب اشارات و ہدایات ہیں۔ باوجود اسکے کہ ان اصولوں میں قانون شکنی کی جانب میلان ہے ان کا اثر مسلمان فقہا پر اور غزالی (۱۱۱۱ء) جیسے زبردست عالم الٰہیات پر اور سعدی جیسے ماہر اخلاقیات پر غالب رہا ہے۔ صوفیوں پر یہ الزام تو نہیں آسکتا کہ انہیں اپنی جان کے ساتھ محبت رہی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ بعض اوقات انہوں نے محبت الٰہی کی خاطر اپنے خارج از جماعت ہمسایوں کو بالخصوص ضرر پہنچایا۔ مگر آخر میں جا کر ان کے توحید کے تخیل نے ان کے لئے اس بات کو ناممکن کر دیا کہ وہ خدا سے تو محبت کریں۔ مگر خدا کی مخلوق سے محبت نہ کریں

تیسری صدی ہجری کے صوفیوں نے اس باطنی مذہب کی مکمل طور پر علمی و عملی بنیاد ڈالیں۔ ذوالنون مصری نے اسلام میں معرفت کے تخیل کو داخل کیا اور اس معرفت کا مفہوم یہ ہے کہ بخلاف استدلال اور روایات کے ذریعہ علم حاصل کرنے کے کیف و حال کے ذریعہ علم حاصل کیا جائے جب ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے خدا کو کیسے جانا تو جواب دیا کہ "عرفت ربی بربی۔ یعنی میں نے اپنے رب کو اپنے رب ہی کے ذریعہ سے پہچانا۔ اور مثل ڈیونیسیس (Dionysius) کے ان کا بھی مقولہ یہ ہے کہ:۔ خدا برعکس[1] ہے ہر اس چیز کے جو کہ تمہارے خیال میں آسکتی ہو"

---

[1] پروفیسر نکلسن کو یہاں بھی التباس ہوا۔ ایسے موقعوں پر صوفیائے کرام لفظ برعکس "نہیں" استعمال کرتے بلکہ "ماورا"

باقی صفحہ ۵۱ پر

اور ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ :- "خدا کا جس قدر عرفان حاصل ہوتا جاتا ہے اسی قدر بندہ خدا میں فنا ہوتا جاتا ہے"۔ اس زمانہ کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ اشارات و اصطلاحات کا استعمال زیادتی کے ساتھ شروع ہو چلا اور ان علوم کو خواص کے لئے مختص کر دیا گیا ہے۔ اور نجس کانوں[1] سے محفوظ رکھا گیا۔ ایران کے ابو یزید یعنی بایزید بسطامی نے فنا کے عقیدہ کا اضافہ ہے کہ اس میں وہ ہندوستان والوں کے اس فلسفیانہ عقیدہ سے متاثر ہوئے ہوں کہ ہر چیز کی جڑ ایک ہی ہے۔ اس کے بعد ہی فنا کا اثباتی لازمہ بقا بھی شامل عقائد کر دیا گیا[2]۔ توحید خالص تک پہنچنے میں ہر چیز کی نفی کرتے چلے جانے کی انتہائی کوشش نے بقول بایزید ہی ان پر سے حجاب اٹھا دیا۔ زمانہ مابعد میں ایرانی صوفیوں کے نزدیک بایزید نے وہ اہمیت حاصل کی کہ ان کے شطحیات مثل "سبحانی" اور عالم رویا میں ان کے حصول معراج کے قصے بیان کرنے سے صوفی تھکتے ہی نہیں۔ بعض اقوال جو بایزید سے منسوب کئے جاتے ہیں یہ ہیں۔

"اللہ کی ساری مخلوق احوال کے تحت میں ہے۔ مگر عارف ان احوال سے مغلوب نہیں ہوتا کیونکہ اس کے آثار سب مٹ جاتے ہیں، اس کی ذات کسی اور کی ذات میں، اور اس کی صفات کسی اور کی صفات میں فنا ہو جاتی ہیں"۔

حاشیہ بقیہ صفحہ ۵۰ :- یہ "برتر" یا اسی نوع کے دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں ؎ اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم و ز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم۔ اور یہ بات قرآنی تعلیم لیس کمثلہ شئی کے بالکل مطابق ہے (ذوقی)

[1] یہاں بھی بجائے "نجس کانوں" کے یہ الفاظ صحیح طور پر استعمال کئے جاتے ہیں "نااہلوں کے کانوں سے"۔ (ذوقی)

[2] "فنا" اور "بقا" کے مسائل عقائد سے تعلق نہیں رکھتے نہ فنا و بقا عقائد میں شامل ہیں۔ بلکہ یہ صرف اصطلاحات ہیں جو عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ کے نتائج بیان کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی کو ہر چیز کی جڑ ایک ہونے کے متعلق ہندوستان والوں کے کسی فلسفیانہ عقیدہ سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کی آیہ الی اللہ مرجعکم جمیعا۔ ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے (ذوقی)

"تیس برس ہوئے کہ خدائے برتر میرا آئینہ تھا۔ اب میں خود اپنا آئینہ ہوں یعنی جو کہ میں تھا وہ اب میں رہا کیونکہ "میں" اور "خدا" (کے الفاظ) توحید الٰہی کی نفی کرتے ہیں۔ چونکہ میں اب نہیں رہا خدائے برتر اب اپنا آپ ہی آئینہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں آئینہ ہوں۔ کیونکہ وہ حقیقتاً خدا ہے۔ جو میری زبان سے گفتگو کرتا ہے اور میں درمیان سے اٹھ گیا ہوں"۔ میں بایزیدی سے اس طرح نکل گیا جس طرح سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ پھر میں نے معلوم کیا کہ عاشق و معشوق و عشق ایک ہیں۔ کیونکہ عالم توحید میں سب ایک ہیں"۔

بایزید اہل سکر کے محبوب پیشوا ہیں۔ برعکس اس کے اہل صحو جنید بغدادی کے متبع ہیں جن کا نظریۂ وصل ان کے شاگرد حلاج نے بیباکانہ حقیقت کے رنگ میں عملاً دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔[1] جب حلاج زندقہ کے سنگین الزام میں گرفتار کئے گئے۔ تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوئی اگر جنید نے ان سے بریت کا اظہار کیا ان کی کتاب الطواسین میں جو عقاید بیان کئے گئے ہیں وہ قطع نظر انا الحق کے بھی جو کہ ان عقائد کا اشتعال انگیز خلاصہ ہے، مسلمانوں کو مشتعل کر دینے کے لئے کافی ہیں مگر وہ عقائد اس درجہ انوکھے، عمیق اور تاریخی اہمیت رکھنے والے ہیں کہ ان کے اہم اجزاء کا خاکہ

---

[1] حسین منصور حلاج اٹھارہ سال کی عمر میں تستر آئے اور دو برس حضرت عبداللہ تستری کی صحبت میں رہے پھر آپ بصرہ تشریف لے گئے اور ڈیڑھ برس حضرت عمرو بن عثمان مکی کی صحبت میں رہے۔ یہاں حضرت یعقوب اقطع نے اپنی صاحبزادی کا عقد آپ کے ساتھ فرما دیا۔ جب حضرت عمرو بن عثمان مکی آپ سے ناراض ہو گئے تو آپ بغداد گئے اور حضرت جنید بغدادی سے آپ نے عمرو بن عثمان مکی کی ناراضی کا سبب بیان کیا۔ حضرت جنید بغدادی نے آپ کو خلوت اور سکوت کی تعلیم فرمائی۔ چند روز بعد آپ حجاز چلے گئے اور ایک سال وہاں قیام کر کے واپس بغداد آئے اور حضرت جنید بغدادی سے کوئی سوال کیا۔ جس کا جواب آپ نے نہ دیا۔ اور فرمایا کہ تو بہت جلد لکڑی کا سر سرخ کریگا۔ یعنی سولی پر چڑھے گا۔ اس بات پر منصور حلاج ناراض ہو گئے اور تستر چلے گئے اور ایک سال تک وہاں رہے۔ ان واقعات کی بنا پر پروفیسر نکلسن کا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت جنید بغدادی کے "نظریہ" وصل کا اظہار بیباکی کے ساتھ حلاج نے کیا اور حضرت جنید رح نے اپنی جان بچانے کی غرض سے حلاج کی گرفتاری پر حلاج سے بریت کا اظہار کر دیا۔

کھینچنے اور ان کے چند پہلوؤں کی جانب توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ صورت حال ہی میں ممکن ہو سکی ہے۔ کیونکہ پروفیسر میگنن (Prof Massignon) نے حلاج کے اوراق پریشان کا پتہ چلا کر ان کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

بقول حلاج کے خدا نے جو کہ حقیقتاً عشق ہے انسان کو اپنی صورت پر اس غایت سے پیدا کیا کہ بندہ صرف خدا ہی سے محبت کرے، اپنے اندر روحانی انقلاب پیدا کر کے خدا کے عکس کا اپنے میں مشاہدہ کرے اور رضائے الٰہی اور فطرت کا تابع ہو کر واصل بالحق ہو جائے یہ ظاہر ہے کہ جس وصل کا حلاج ذکر کرتے ہیں اور جس کا انہیں خود تجربہ ہوا وہ حلولیوں کے ہمہ اوست سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ گو مسلم اور یورپین مصنفین نے ایسا کہا ہے۔ حلاج نے اپنے اظہار مطلب کی غرض سے حلول کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ اس کے ہم مذہبوں کے ذہن میں مظہریت کے عیسائی عقیدہ سے ملتبس ہو گئی۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حلاج نے جہاں تک کہ ان کی ذات کا تعلق ہے اس اصطلاح کو اس معنی میں استعمال کیا ہو مگر ان کے دوسرے عجیب و غریب اقوال ایسے ہیں جن کی رو سے مسلمان صوفیا میں انہیں سب سے زیادہ قریب روح مسیح سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک ولی واصل باللہ کا مرتبہ پیغمبر سے جو کہ خلق کے ساتھ مشغول رہتا ہے بڑھا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا اعلیٰ نمونہ محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پیش نہیں کیا بلکہ عیسیٰ (علیہ السلام) نے پیش کیا جو کہ برگزیدہ انسانیت کا نمونہ تھے اور ہستی حق میں اپنے ظاہر و باطن سے فنا ہو کر مظہر حق و نمائندہ الٰہی بن گئے تھے۔[1] حق تعالےٰ ان سے ظاہر ہوتا تھا۔ اور وہ خالق سے ظاہر ہوتے تھے۔ اور

---

[1] نہ معلوم حلاج نے کیا لکھا اور پروفیسر میگنن یا نکلسن نے کیا سمجھ لیا کیونکہ حلاج کی اصلی تحریر اس نہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں بڑوں بڑوں سے غلطی ہوئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ پیغمبر میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہت حق یعنے وہ جہت جس سے وہ حق تعالےٰ سے متصل ہوتا ہے یا حق تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اخذ فیضان کرتا ہے اور دوسری جہت خلق یعنی وہ جہت جس سے وہ خلق سے متصل ہوتا ہے یا خلق کی طرف متوجہ

(باقی صفحہ ۵۴)

حقیقتہ الحقائق ان پر محیط تھا۔ مزید برآں پروفیسر میگنن (Massignon) کے قول کے بموجب حلاج کا تخیل وصل یہ ہے کہ بندہ واصل بامر کن ہو جائے اور یہ لفظ "کن" قرآن میں ولادت مسیح اور قیامت سے متعلق کیا گیا ہے[1]۔ اس نوع کا وصل احکامات الٰہی کی صحیح تفہیم اور شدید پابندی پر موقوف ہے۔ اس نوع کی تفہیم اور پابندی کے مستقلاً حصول کے بعد صوفی کی روح میں خدا کی روح آجاتی ہے۔ جو کہ امر رب (قرآن سورہ بنی اسرائیل۔ آیت ۸۷) کا کرشمہ ہے پھر اسکے بعد بندہ کا ہر فعل خدا کا فعل ہوتا ہے۔ حلاج نے سبق پڑھا تھا کہ تقدیس کی تکمیل بغیر مصائب، اور ذاتی قربانی کے حاصل نہیں ہوتی۔ اس سبق میں پختگی کا ثبوت دینے میں بھی انہوں نے کوتاہی نہ کی۔ ۹۲۲ء میں انہیں دار پر کھینچا گیا۔ جب انہیں صلیب کے پاس لایا گیا اور انہوں نے صلیب کی میخوں کو دیکھا تو لوگوں کی جانب رخ کر کے ایک دعا مانگی جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"اور اے خدا! یہ لوگ جو مجھے قتل کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں تیرے ہی مذہب کی پرجوش حمایت اور تیری ہی خوشنودی کے حصول کی تمنا میں آئے ہیں۔ تو انہیں معاف فرما دے اور ان پر اپنی رحمت نازل فرما۔ کیونکہ اگر تو نے ان پر وہ بات ظاہر کر دی ہوتی۔ جو بات کہ تو نے مجھ پر ظاہر کی ہے۔ تو وہ اس کام کو نہ کرتے جس کام انہوں نے کیا اور اگر تو نے مجھ سے وہ بات پوشیدہ رکھی ہوتی جو بات کہ تو نے ان سے پوشیدہ رکھی تو میں ان شدید مصائب

(بقیہ صفحہ ۵۳) ہو کر خلق کی اصلاح کرتا ہے اور جو فیضان جہت اول کے ذریعہ اس نے حاصل کیا وہ خلق کو پہنچاتا ہے۔ جہت اول کو فضیلت دی جاتی ہے۔ جہت ثانی پر کیونکہ توجہ الی الحق افضل ہے توجہ الی الخلق سے۔ توجہ الی الحق کو ولایت اور توجہ الی الخلق کو نبوت کہتے ہیں۔ ہر پیغمبر میں ولایت اور نبوت کا اجتماع لازمی ہے۔ اور اس کی ذاتی ولایت کو اس کی ذاتی نبوت پر فضیلت ہے۔ جب صوفیا کی تحریروں میں اس نوع کی عبارت پائی جاتی ہے۔ کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت ہے تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں۔ کہ ہر نبی کی ولایت کو اس کی نبوت پر شرف حاصل ہے۔ ورنہ یوں تو ہر نبی کو ہر ایسے ولی پر جو کہ جرمنی نہ ہو ہر اعتبار سے فضیلت حاصل ہے اور نبی آخر الزمان کو جملہ انبیاء پر ہر لحاظ سے فضیلت کلی حاصل ہے۔ (ذوقی)

[1] اصل انگریزی کتاب میں عبارت کا یہ حصہ نہایت مہمل ہے۔ لفظ "کن" تو پوری کائنات کی ہر چیز کی تخلیق سے متعلق ہے۔ ولادت مسیح اور قیامت کی تخصیص کے کیا معنی۔ (ذوقی)

میں مبتلا نہ ہوتا۔ تیری شان عظیم ہے۔ تو جو چاہے ارادہ فرمائے اور جو چاہے کرے
تجھے سب زیبا دیتا ہے۔"

اسلام میں لوگوں کے اعمال پر حکم لگایا جاتا ہے، اور جمہور کے خلاف عقائد کے کسی کے دل میں پیدا ہونے کی روک تھام عام طور پر سزاؤں کے ذریعہ سے نہیں کی جاتی۔ صوفیاء کے عقاید خواہ ظاہر شریعت سے کتنے ہی ٹکرائیں۔ جب تک کہ صوفی اپنے دوسرے مسلمان ساتھیوں کی طرح عبادت کئے چلا جاتا ہے اسے کوئی شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ حلاج ارکان مذہب کی پابندی میں بہت سخت تھا اور اس نے ان ادنیٰ منزلوں کی کبھی تحقیر نہیں کی۔ گو انہیں کبھی سراہا بھی نہیں جن کے ذریعہ سے انسان کو خلوص قلب اور عبدیت (جو کہ حقیقت مذہب ہے) کی بلندی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ یہ اکثر صوفیا کی روش رہی ہے اور وہ آقاؤں کی خدمت کرنے کی یہی صورت بہترین بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حلاج کا میلان اپنے ضمیر کا ساتھ دینے پر حد سے بڑھا ہوا تھا۔ فقہا اور حکومت اسلامی کے اقتدار کے مقابلہ میں اس نے اپنے ذاتی اقتدار کو پیش کر دیا جو باعتبار ولی واصل حق ہونے کے اس نے براہ راست خدا سے اخذ کیا تھا۔ وہ مثل جنید کے صاحب نظریہ ہی نہ تھا بلکہ قرامطہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کا بھی اس پر شبہ کیا گیا تھا۔ اور اس نے اپنے عقائد کی تعلیم مومن و کافر کو یکساں طور پر دینی شروع کر دی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی تائید میں اس نے اپنی کرامتیں دکھلا دکھلا کر لوگوں کو اپنا ہمخیال بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان وجوہ سے اس کے خلاف ٹھیک فتویٰ ہوا۔ اس کا قصور یہ تھا جیسا کہ صوفیائے متاخرین کہتے ہیں کہ اس نے ربوبیت کا راز فاش کر دیا۔ بلکہ اس پر الزام یہ تھا۔ کہ اس نے اپنے اندر کی آواز پر عمل کر کے ایک ایسی حقیقت کو ظاہر کر دیا.....

.....اور اس پر زور دیتا رہا

جس سے مذہبی، سیاسی اور تمدنی شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا۔ دوسرے صوفیوں پر بھی وہ

حقیقت منکشف ہوئی مگر حلاج اسی حقیقت کی خاطر جیا اور اسی کی خاطر مر گیا۔ یہی سبب ہے کہ حلاج کے کلام میں جس میں کہ اس نے وصل محبوب کی تمنا کی ہے اور اپنی تسلیم و رضا کا اظہار کیا ہے جذبۂ الفت اور تاثیر کا وہ رنگ ہے جو صوفیا کے کلام میں کمیاب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"کہ میرے اور تیرے درمیان "میں" کا حائل ہونا مجھے سخت تکلیف دیتا ہے۔ اپنی مہربانی سے "اس میں" کو درمیان سے نکال دے۔"

"میں وہ ہوں اور وہ میں ہے ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں بستی ہیں اگر تو نے مجھے دیکھا تو گویا تو نے اُسے دیکھا اور اگر تو نے اُسے دیکھا تو تو نے ہم دونوں کو دیکھ لیا۔"

یہاں ضمناً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان خیالات کا اظہار کرنے والا یونانی فلسفیوں کا سا "ہمہ اوست" کہنے والا (Pan ineism) نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو جیلی (یعنی حضرت عبدالکریم جیلی رح) نے ان توحیدی الفاظ میں ظاہر کیا ہے:۔ "ہم ایک ہی روح ہیں۔ جو دو جسموں میں بستے ہیں۔" اور جلال الدین رومی کہتے ہیں کہ:۔ "کس مسرت کی وہ ساعت ہے جبکہ ہم دونوں یعنی تو میں ایک ہی محل میں بیٹھے ہوں۔ جسم دو ہیں۔ صورتیں دو ہوں۔ مگر روح تیری اور میری ایک ہی ہو۔"

حلاج کا بعض اوقات معنی خاص کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ میں خدا ہو گیا ہوں اور ساتھ ہی اسکے خدا کے منزہ و برتر و رفیع الدرجات ہونے پر بھی پوری قوت سے زور دینا ایسے شخص کو تعجب میں نہیں ڈال سکتا جس کا کہنا یہ ہو کہ بادی النظر میں منطقی محالات تصوف میں جا کر حقائق ثابتہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ حلاج کے ابتدائی اصول حلاج کے بعد زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے تاہم ذہنیت مابعد کے لئے وہ بنیاد بن گئے۔ مثال کے طور پر انسان کامل کے متعلق اس تخیل کو جو ابن عربی کی تصانیف اور تصوف کی فارسی شاعری میں اس قدر غالب ہے۔ مگر ان چیزوں کے مطالعہ سے حلاج کی خصوصیات

کا پتہ نہیں چلتا نہ اُس کی اس ذاتی مصیبت کا حال معلوم ہوتا ہے جس کی جانب اس نے اس مشہور اور بہت ہی مستعمل شعر میں اشارہ کیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

حلاج کی وفات کے بعد کی صدی اگرچہ دیگر اعتبارات سے اسقدر نتائج خیز ثابت نہیں ہوئی تاہم اس دور میں تصوف پر باقاعدہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مثلاً ابو النصر سراج کی کتاب اللمع اور ابو طالب مکی کی قوت القلوب جن کے ذریعہ بہت قیمتی معلومات جن کا ماخذ ضائع ہو چکا ہے محفوظ چلی آرہی ہیں۔ اس زمانہ میں تصوف نے فلسفہ یونانی کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر اسلام سے ہٹنا اور یونانی فلسفیوں کے ہمدست (Pan-theism) اور شریعت سے آزادی اور بالخصوص عقیدۂ صدور (Emanation) کی جانب بڑھنا شروع کیا اسکی بین مثال ابرانی صوفی ابو سعید ۹۶۷-۱۰۴۹ء کے سوانح اور کلام میں ملتی ہے۔ بعض اعتبارات سے ان کی تعلیم قابل تعریف ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ:-

"سچا ولی لوگوں میں آتا جاتا رہتا ہے۔ اُن کے ساتھ کھاتا پیتا ہے سوتا جاگتا ہے بازاروں میں جا کر خرید و فروخت کرتا ہے، شادی بیاہ کرتا ہے خلق سے ملا جلا رہتا ہے۔ مگر باوجود ان تمام باتوں کے اللہ کو ایک لمحہ کے لیئے بھی نہیں بھولتا"

انہوں نے تمام مخلوق کو "خالق کی آنکھ" سے دیکھا اور فیاضی اور شفقت کے برتاؤ کو اسقدر اہمیت دی کہ ان کے نزدیک خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں کہ ایک مسلمان کا دل خوش کر دیا جائے انہوں نے شریعت سے ولی کے تعلق کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اسکا مقابلہ حلاج کے اقوال و افعال سے کیا جائے تو بلحاظ معنی و بلحاظ عمل بہت فرق معلوم ہوگا۔ حلاج نے حتی الوسع

پابندی شرع کی پوری کوشش کی یہاں تک کہ اسے اس لاینحل معرکہ سے سابقہ پڑا جس میں تعمیل شریعت کا مقابلہ ان احکام کی تعمیل سے تھا جو وہ حاکم برتر کی جانب سے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ برعکس اس کے ابوسعید کے نزدیک شریعت کی پابندی اُنکے لیئے تو لازمی ہے جو درمیانی منازل میں ہوں لیکن اُنکے لیے غیر ضروری ہے جو مقصود تک رسائی پا چکے ہیں۔ اُن کے نزدیک وصول الی اللہ کبھی کبھی یا باری باری سے ہونے کی چیز نہیں بلکہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا وہ ایک مستقل اور دائمی نتیجہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مریدوں کو حج کعبہ سے منع کر دیا تھا۔ اور خانہ کعبہ کو حقارت سے ایک پتھر کا مکان کہا تھا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اذان سن کر اُنہوں نے اپنا رقص درویشی موقوف نہ کیا اور کہا کہ "ہماری یہی نماز ہے"۔ یہ واقعات حرفاً حرفاً صحیح نہ بھی ہوں تب بھی یہ نمونے کا کام دیتے ہیں۔ مشہور رسالہ قشیریہ میں جو ۱۰۴۵ء میں تصنیف ہوا تھا قدیم طرز کے متبع سنت صوفیوں کے زہد و تقوی کا مقابلہ مصنف نے اپنے زمانہ کے صوفیوں کی بے شرعی اور منافقت سے کیا ہے۔ اس زمانہ کے بھی تیس سال بعد صاحب کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ ان کے ہمعصروں نے شہوت کا نام شریعت، توہمات لایعنی کا الہام، نفسانیت و بہیمیت کا نام عشق الٰہی، بدعت کا نام فقر، شبہات کا نام تصفیہ قلب، اور مذہب اصلی سے انکار کا نام ترک و تجرید رکھ لیا ہے۔ جب کہ اولیاء اور ان کے بے شمار معتقدین و متبعین کی جماعت تاریخ و روایات اسلامی کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھی علماء کے گروہ میں تنازعات باہمی پھیل رہے تھے اور یا تو محض کوتاہ فہمی اور تعصب سے قرآن کے الفاظ ظاہری کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے یا فروعات فقہ میں الجھ رہے تھے یا خشک عقل کی روشنی میں اصولی عقاید کے تجزیہ درپے تھے اور مذہب کو حقیقتاً مذہب بنانے والی باتوں سے جو کہ مذہب کی جان ہیں سرعت کے ساتھ بے تعلق ہوتے جاتے تھے بہت سے جوشیلے مسلمان اس وقت اپنے دل میں یہ سوال کرتے ہوں گے کہ یہ حالات کب تک قائم رہیں گے

اور کوئی ایسی صورت بھی ممکن ہے جو مذہب کی اصلیت کو تو قائم رکھے مگر لوگوں میں پھوٹ نہ پڑنے دے۔ اس سوال کا جواب ایک ایسے شخص کے درمیان میں آجانے سے مل گیا جو اسلام کے سب سے بڑے لوگوں میں سے ہے اور جس کا نام ابو حامد غزالی ہے (۱۰۵۸ء-۱۱۱۱ء) اور جو زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں ابو حامٹ (ABUHAMET) اور الغزل Alghazel کے نام سے مشہور ہے

غزالی کے صوفی بننے کا قصہ جو انہوں نے خود قلمبند کیا ہے اپنے طرز کی ایک نہایت ہی عالمانہ تحریر ہے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا کہ وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں شکی طبیعت کے تھے تصوف کے مشاہدات نے اُن کے اس مرض کا ازالہ کر دیا فلسفہ اور علم کلام میں ان کے تجربے انہیں اطمینان نہ دلا دیا کہ ان علوم سے اطمینان پیدا کرنے والی روشنی مقصود ہے۔ دیگر فرقوں کی تعلیمات سے بھی مطلب براری نہ ہو سکی۔ تب انہوں نے اس تصوف کی جانب توجہ کی جو حارث محاسبی اور تیسری صدی کے صوفیائے اکابرین فن لکھ گئے تھے اور اس سے ان پر حقیقت منکشف ہو گئی وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جو امور صوفیا کے لئے مختص ہیں وہ کتابوں کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ عمل اور کیوف اور اندرونی انقلابات ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں یعنی بالحاظ دیگر صوفیوں کی روش اختیار کرنے اور ان کے سے اعمال پر کاربند ہونے سے وہ باتیں حاصل ہوتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کی نجات خطرہ میں ہے۔ دنیا کی شان و شوکت حاصل کرنے کا انہیں بہت اچھا موقع تھا۔ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے میں انہیں سخت کشمکش سے سابقہ پڑا اس کشمکش میں ان کی صحت تک خراب ہو گئی۔ مگر بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور مثل اس شخص کے جسے مصائب شدید میں کوئی دوسرا سہارا نہیں ملتا انہوں نے خدا کی پناہ ڈھونڈ لی۔ انکی عمر چالیس برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انہوں نے بغداد اس قصد سے ترک کر دیا کہ پھر کبھی وہاں واپس نہ ہوں گے۔

سنہ مگر پروفیسر نکلسن صاحب صرف کتابوں کے مطالعہ ہی سے سمجھتے ہیں کہ ان میں وہ بصیرت پر جو کئی کہ صوفیا کے اقوال و افعال پر صحیح تنقید کر سکیں (ذوقی)

حاصل یہ کہ حقیقت صوفیاء ہی کے پاس نکلی اور اس حقیقت کے متعلق غزالی کے ذاتی تجربوں اور ان کی تصانیف بالخصوص احیاء العلوم نے ان لوگوں میں بھی جو کہ اس وقت تک تصوف کے خلاف تھے تصوف کی موافقت میں ایک جوش عظیم پیدا کر دیا، اس زمانے کے بعد سے صوفیاء بھی قطعی طور سے اسلام میں داخل سمجھے جانے لگے۔ کیونکہ غزالی اور ان کے بعد بکثرت مسلمانوں کے نزدیک جو انکشافات کہ اولیاء اللہ کو ہوتے ہیں وہ پیغمبروں کے انکشافات ہی کی تائید میں ہوتے ہیں اور پیغمبروں کے انکشافات سرچشمہ ہیں جملہ علوم حقائق کے۔ مگر ساتھ ہی اسکے غزالی اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ ولایت ماخوذ ہے نبوت سے[1] اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور ان کے احکامات کی ظاہری و باطنی تعمیل سب پر فرض ہے اور گو غزالی کا یہ عقیدہ کہ روح ایک آئینہ ہے جسمیں قدسی چنگاری سے روشنی پیدا کی گئی ہے اور جسمیں اللہ کی ذات و صفات منعکس ہیں زیادہ دلیر صوفیوں کو خلاف شرع عبارتوں پر ابھار سکتا ہے مگر غزالی اپنی ذات سے خطرہ سے محفوظ رہے شاید انکے دل میں جو خیالات مخفی ہوں وہ ان خیالات سے بڑھے ہوئے ہوں جن کا انہوں نے اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے۔ گو انہوں نے مشکوٰۃ الانوار میں اس قسم کے فقرے بھی لکھے ہیں کہ: "اللہ آفتاب ہے اور آفتاب کے علاوہ جو کچھ ہے وہ آفتاب ہی کی روشنی ہے" مگر اسلام میں یونانی ہمہ اوستی (Pantheistic) زبان کے استعمال سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس زبان کا استعمال کرنے والا بھی یونانی ہمہ دستی (Pantheistic) ہو۔ غزالی کبھی کبھی توحید کے مسئلہ کو انتہائی حد دو تک لیجاتے ہیں مگر ساتھ ساتھ وہ اس کے ارادہ سے بھی نہیں چوکتے کہ خدا خالق ہے جس نے محض اپنے ارادہ سے کائنات کی تخلیق فرمائی۔

---

[1] دراصل ایک نبی کی نبوت اسکی ولایت سے اخذ ہوتی ہے اور دوسرے اولیاء کی ولایت اس نبی کی نبوت سے ماخوذ ہوتی ہے جس کے وہ زیر قدم ہو اور صدر رسول اللہ علیہ و آلہ وسلم مجموعہ میں جملہ انبیا کی نبوت و ولایت کی نسبتوں کا (زرقی)

تصوف کا ان پر جتنا بڑا احسان تھا۔ اس کا حق بھی انہوں نے پوری طرح ادا کر دیا۔ اکثر صوفیا کا بھی خیال ہے اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کہ غزالی اتنے زیادہ صوفی نہ تھے جتنے کہ وہ وسیع الخیال مسلمان تھے اور انکے سچے زہد و تقویٰ اور اخلاقی بلند یوں اور سنت پر استحکام نے انہیں اسلام میں راسخ کر دیا تھا۔ اور گو اسبات کو وہ لوگ نہ مانیں مگر بات یہ ہے کہ انکی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی نے انہیں پختہ بنا دیا تھا۔[1] تصوف کو مذہب اصلی بنا دینے میں تو انکو اتنی زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور یہ امر مشکل بھی تھا۔ مگر اصلی مذہب کو تصوف بنا دینے میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی انہوں نے اس تحریک میں قدامت پسند لوگوں کی ایک قوی جماعت کو گھسیٹ لیا اور اس بات نے اس طوفانی دور میں جو کہ آنے والا تھا بڑی روک تھام کی۔ مگر اسکے بعد اس تحریک کو چلانے والی قوت ایک اور ہی جانب سے آنی شروع ہوئی اور جن خیالات نے اب ہجوم کیا اور اس تحریک کو بڑھایا اور آئندہ کیلئے تسلط پالیا وہ غزالی نے خیالات سے مختلف تھے۔ فرقہ ہائے جدید کے متبعین سوال اس واقعہ پر پردہ نہیں ڈال سکتے کہ ان کا روحانی وطن مکہ نہیں بلکہ اتھنس اور سکندریہ ہے۔ تصوف کی تاریخ میں غزالی کا رشتہ تھا جو اس رسمی عبادت کے برعکس ہے جو خوف و حکومت کے تحت کی جاتی ہے اس رشتہ الفت کے ساتھ انہوں نے ان الہیات کو شامل کر لیا جو قدرے قرآن سے ماخوذ تھیں اور قدرے ارسطو اور اشراقین یا نوفلاطونیوں Neo-Platonists سے جوں جوں اسلام کا تسلط کمزور ہوتا گیا خارجی عناصر قوت پکڑتے گئے حتیٰ کہ بربادی خلافت نے ان خارجی عناصر کو میدان کا پورا مالک بنا دیا۔ نتیجہ فلسفہ ہے اوست یونانی (Pan Theistic Philosophy) کی صورت میں برآمد ہوا۔ جو اب سات سو برس کے بعد بھی اسلامی دنیا کے بڑے

---

[1] مگر امام غزالیؒ تو یہ فرماتے ہیں کہ عملی تصوف نے ان میں پختگی پیدا کی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی تو ان میں پہلے تھی۔ مگر کسی کام نہ آئی۔ یہ میرا تمہیدی نوٹ ملاحظہ ہو۔ (ذوقی)

حصہ پر حکمران ہے اور جسے جلال الدین رومی حافظ اور دیگر ایرانی صوفی شعرا نے بیان کر کر کے لوگوں کو گرویدہ بنا لیا ہے گو یہ لوگ اس ملک کے اصلی مصنف اور ابتدائی موجد ابن العربی (۱۱۶۵-۱۲۴۰) کی تصانیف کو سمجھ نہ سکیں۔ ان امور کے متعلق کچھ کہنے سے قبل آؤ ذرا ہم اس زمانہ کی دوسری خصوصیت پر بھی غور کر لیں۔ بارہویں صدی (عیسوی) میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی اس وسیع تحریک و تنظیم کا آغاز ہوا جو زمانہ وسطیٰ کی عیسائی دنیا کے راہبوں کے سلسلوں سے ملتی جلتی ہے اس سے قبل مشہور مشائخ اپنے مریدوں کو اپنے پاس جمع کرتے تھے اور مریدین کی یہ جماعتیں بعض اوقات خانقاہوں میں سکونت اختیار کرتی تھیں۔ مگر ان مختلف تعلیمگاہوں میں کسی قسم کا ربط باہمی نہ ہوتا تھا۔ اور یہ خانقاہیں جلد یا بدیر بند ہو جایا کرتی تھیں۔ طالبوں کی مفت تعلیم پانے والی ان جماعتوں کے بجائے جن میں شیخ کی ذاتی توجہ سے فیضان پہنچایا جاتا تھا۔ اب سلسلے قائم ہو گئے۔ ہر سلسلہ میں اولیاء کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے جو پیغمبر صاحب سے شروع ہو کر بانی سلسلہ پر ختم ہوتی ہے ان مختلف سلاسل میں دستور العمل بھی مختلف ہوتا ہے، اصول بھی مختلف ہوتے ہیں اور شریعت کی جانب میلان میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ داخل سلسلہ ہونے کے لئے بالعموم تجرد کی شرط نہیں ہوتی اگرچہ ان سلسلوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں مگر زیادتی کے ساتھ بالخصوص غرباء ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ ہر نیک و بد میں ان لوگوں کا دوسروں پر بڑا اثر ہے بعض یورپین معترضین نظری ہمہ اوستی (Theoretical Pantheism) اور عملی بداخلاقی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر مشرقی طبائع کو ان مبتدیانہ تطبیقات کے تحت میں نہیں لایا جا سکتا۔ صوفیوں کا ہمہ اوستی عملی زندگی میں خدا کی ہستی اور خدا کے احکام کی تعمیل کی ضرورت پر مشتمل ہے گو اس بات کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام میں مستند مسلمات اصولی نہ ہونے کی بنا پر صوفیوں کو ایک آزادی حاصل ہے جس کا ان میں سے اکثر غلط استعمال کرتے ہیں۔

محی الدین ابن عربی جو گروہ صوفیاء میں پرواز تخیل کے سب سے بڑے استاد ہیں ملک اندلس

کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ء میں دمشق میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کا فلسفہ کائنات ضخیم ضخیم مجلدات میں موجود ہے جن میں مشہور ترین تصانیف فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم ہیں۔ ان تصانیف کا بڑا حصہ ادق اور غلط ہے تاہم ان کا مطالعہ کرنے والوں میں سے کوئی شخص بھی مصنف کی دماغی اور تخیلی قوت پر حیرت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ گو بعض لوگوں مثلاً عبدالکریم جیلی (۱۴۱۰ء) نے ان ہی باتوں کو زیادہ وضاحت اور زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل خاکہ میں صرف چند اہم نکات ہی کو لیا جاتا ہے۔

ابن العربی پکے موحد ہیں اور انکے مسلک کو وحدت الوجود کا جو نام دیا گیا ہے وہ صحیح طور پر اس مسلک کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جملہ اشیاء کا وجود خیالی پہلے سے علم الٰہی میں موجود تھا۔ زمین سے یہ اشیاء نکلیں اور وہیں مراجعت کریں گی نفی محض سے خلقت وجود میں نہیں آئی۔ بلکہ کائنات ظہور ہے اسکا جو باطناً خدا ہے۔ ہر چیز کسی صفت الٰہی کا مظہر ہے اور انسان عالم صغیر ہے جس میں جملہ اسماء و صفات کا اجتماع ہے اور صرف انسان ہی میں خدا پوری طرح اپنے سے باخبر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ جس میں کہ ناسک (Gnostic ism) شراقیت (Neo-Platonism) عیسائیت اور دیگر خارج سے اجزاء کو لے کر شامل کیا گیا ہے ابن العربی کے مسلک میں نہایت مرکزی حیثیت اختیار

لہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ محی الدین ابن عربی رح نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا وہ ظنیات اور پر واز تخیل کے نتیجہ ہیں ہے؟ کیا بس اس کا بھی ثبوت ہے کہ کشف و الہام پر ونیسر نکلسن کے فہم سے بالا تر امور ہیں؟ کیا جو چیز پر ونیسر صاحب کی عقل سے ماوراء ہو اس کا وجود ہی محال ہے؟ ابن عربی رح کی تحریریں بھی پر ونیسر صاحب کے فہم سے بہت ارفع ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون میں ان تحریروں کا خلاصہ بالکل غلط دیا ہے اور ابن عربی رح کی تحریروں کی باریکیوں کو وہ بالکل نہیں سمجھے (ذوقی)

کئے ہوئے ہے یہ لب لباب ہے اصول تخلیق کائنات کا الہیت کو ایک شئے خارجی قرار دیکر اصلی انسانی تخیل میں ظاہر کیا گیا ہے جس کا پہلا جسدی اوتار آدم ہے۔ انسان کامل خدا کی صورت و فطرت کا نمونہ ہے اور رحمت الٰہی اور تنظیم کائنات کے درمیان واسطہ ہے جسکے ذریعہ سے دنیا زندہ اور قائم رکھی جاتی ہے۔ اور لازمی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدرجہ اتم انسان کامل ہیں ابن العربی سے بہت پہلے ہی، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی کی قدامت کا عقیدہ تسلیم کیا جا چکا ہے سب سے پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی سمجھا جاتا ہے کہ نور محمدی ہے جو آدم میں آیا اور نسلاً بعد نسلٍ تمام پیغمبروں میں ہوتا ہوا بالآخر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صورت میں ظاہر ہوا اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ان سے علی اور ائمہ اہل بیت میں منتقل ہوا مگر صوفیاء کا عقیدہ ہے کہ یہ نور جملہ اولیاء میں مساوی ہے۔ ابن العربی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دراصل حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ یہ وہ فقرہ ہے جسے اورگن (Origen) نے اصول یا کلمہ تخلیق کائنات (امر کن) کے بیان کرنے اور ارسطو کے "عقل فعال" کی جانب اشارہ کرنے میں استعمال کیا ہے۔ اس حیثیت سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تخلیق کائنات کے لئے واسطہ بنے اور اس دنیا میں خدا کے خلیفہ بنے اور قطب بنے جن پر اس دنیا کا قیام منحصر ہے اور جن کے لئے یہ دنیا بنائی گئی اور تنہا وسیلہ بنے جملہ الہامات ربانی کا کیونکہ آپ پیغمبر تھے جب کہ آدم مٹی تھے۔ یہ سینٹ پال اور مصنف انجیل چہارم کے اقوال متعلق بہ مسیح کی کچھ آواز بازگشت سی معلوم ہوتی ہے ممکن کہ کسی حد تک ایسا ہو بھی۔ بہر نوع ابن العربی عیسائیت کے ساتھ ایک خاص قسم کی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور لفظ کلمہ کا استعمال مسیح و محمد (علیہما السلام) دونوں کیلئے کرتے ہیں صرف

سلہ کلیات اور پرداز جیل سے یہاں پروفیسر صاحب کام لے رہے ہیں یا حضرت ابن عربی رح؟ صرف مماثلت ناقص مماثلت جزوی سے، غذا کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ محض مماثلت کلی سے بھی اس امر میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا (ذوقی)

ان دو ہی میں اسے مقید نہیں کرتے[1]۔ خالص توحیدی تصوف تقریباً لازمی طور پر یا فلسفہ ہمہ اوست (Pan Theism) کی جانب رہنمائی کرتا ہے یا اولیاء پرستی کی جانب یا جیسا کہ اسلام میں پیش آیا دونوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یا اولیاء پرستی کی جانب یا جیسا کہ اسلام میں پیش آیا۔ دونوں کی جانب خالص فطرت الٰہی سے قطع نظر کر کے توجہ شخصی کے لئے حد نظر صرف پیغمبر یا ولی ہی تک پہنچکر رہ جاتی ہے جن میں سے اور جن کی وساطت سے خدا اپنے کو ظاہر کرتا ہے تخلیق کائنات کے متعلق ان اسلامی اصول کلی کے وجود میں آنے کا سبب اس مذہبی جوش کی تسکین کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ جو توحید الٰہی میں فرق آنے دینا گوارا نہیں کرتی۔ مسیحیت نے تشخیص الٰہی میں جو تفریق کی ہے اس کو چھوڑ کر یہاں تفریق حیثیات سے کام لیا گیا ہے۔ انسان کامل دنیا میں خدا کا مظہر ہے۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صوفیانہ عبادت[2] اکثر ان الفاظ میں ہوا کرتی ہے جنہیں رسول مکی خدا کی شان میں گستاخی قرار دیتے "نور محمدی کا ظہور نہ ہوتا تو زمین پر کسی اسرار کا اظہار نہ ہوتا نہ کوئی چشمہ جاری ہوتا نہ کوئی دریا بہتا" صوفی انہیں "اللہ کا محبوب" کہتے ہیں اور وہ اللہ کے عطیات کو ان لوگوں پر تقسیم کرتے ہیں جو ان سے محبت اور رابطہ روحانی رکھیں۔

ابن عربی کے نزدیک پیغمبر اولیاء کا احترام ان بکثرت عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے جن کے ذریعہ خدا اپنا اظہار فرماتا ہے بقول انکے سچے صوفی کے لئے خدا ہر مذہب میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔ "میرے دل میں ہر صورت سما سکتی ہے۔ میرے دل میں دیر کے لئے بھی گنجائش ہے۔ اور قرآن کیلئے

---

[1] جب لفظ "کلمہ" کے استعمال کو وہ صرف ان دو ہی میں مقید نہیں کرتے تو تخصیص ہی کیا ہوئی پروفیسر صاحب کو اس کھینچ تان کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق سمجھتا ہے اور اصلی اور سچے مذہب عیسوی کے ساتھ نہ کہ بگڑی ہوئی مسیحیت کیساتھ ہمدردی رکھتا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ابن عربیؒ کو اگر سچی عیسویت کے ساتھ ہمدردی تھی تو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی (ذوقی)

[2] کوئی مسلمان خواہ وہ صوفی ہو یا غیر صوفی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت نہیں کرتا۔ ہاں آپکا احترام آپ سے محبت ہر مسلمان کا فرض ہے عبادت و احترام میں فرق ہے۔ ہر عبادت محبت و احترام ہے مگر ہر محبت و احترام عبادت نہیں اولاد باپ سے محبت بھی کرتی ہے اور احترام بھی۔ یہ محبت و احترام عبادت نہیں۔ پروفیسر نکلسن نے یہاں بھی مسلمانوں کو مسیحی نگاہ سے دیکھا ہے۔ (ذوقی)

بھی۔ وہ آہوؤں کی چراگاہ ہے۔ اور پاکبازوں کا کعبہ۔ توریت کی تختیاں بھی اس میں ہیں۔ اور قرآن بھی عشق میرا مذہب ہے اس کے اونٹ جہاں چاہیں پھریں۔ مگر میں تو اپنے سچے عقیدہ ہی پر قائم ہوں۔"

مذہب والوں کا خدا، صوفیوں کے خدا کے مقابلہ میں محدود ہے۔ بدیں وجہ اپنے ہی مسلک کے لوگوں کی تعریف اور غیر مسلک والوں کی مذمت جہالت اور ناانصافی ہے۔ لامذہب اور بت پرست بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کی صورت پر پیدا کئے گئے ہیں اور اسکے بندے ہمدردی کے زیادہ مستحق ہیں گو شریعت ان کے لئے سزائے موت ہی کیوں نہ تجویز کرے۔ بلحاظ اسکے کہ روح ہستی حق کا ایک پہلو ہے۔ ابن العربی نتیجہ نکالتے ہیں کہ افعال انسانی خود مختارانہ ہیں مگر ان کے مسلک میں اس اختیار کے عام فہم معنی نہیں۔ خدا خود افعال کا صدور بمقتضائے فطرت الٰہی فرماتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی لامحدود صفات سے لامحدود آثار مترتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نور و ظلمت، نیکی اور بدی اور دیگر اضداد کا ظہور بھی یقینی ہے اور ان اضداد کے بغیر علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ چونکہ شر محض کا وجود ہی نہیں، دوزخ ایک عارضی چیز ہے جس سے دوزخی بالآخر نجات پا جائینگے۔

ابن العربی کی تصنیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اسپینوزا (Sponiza) کی یاد دل میں لاتی ہیں۔ مگر اس نتیجہ پر آنا ذرا مخدوش ہوگا کہ اندلسی یہودی کو اندلسی مسلم کے خیالات پر آگاہی تھی کیونکہ اندلسی یہودی کی باطنی تفسیر توریت کے مباحثوں نے اس امر کو مخفی کر دیا ہے۔ کہ وہ خود بھی ایک سنجیدہ اور جدت پسند غور و خوض کرنے والا شخص تھا۔ تاہم ابن العربی نے زمانہ متوسط کے بعض عیسائی علماء کو ضرور متاثر کیا اور جیسا کہ پروفیسر ایس پیلیوز (Professor Asiam Palacios) نے حال ہی میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے ان کے دوزخ، جنت اور عالم بالا کے نقشوں میں جو خصوصیات تھیں۔ ان کو ڈانٹے (Dante) نے اپنی تحریروں میں اس قدر ملتا جلتا بیان کیا ہے کہ اسے محض توارد قرار دینا دشوار ہو گیا ہے عوالم سفلی، افلاک انجم، دوائر روحانی، مرکز نور قدسی

کے گرد ملائکہ کے حلقے اور تثلیث کی جانب اشارہ کرنے والے دوائر ثلاثہ جو ڈانٹے (Dante) نے بیان کئے ہیں۔ وہ بجنسہٖ وہی ہیں جو ابن العربی نے بیان کئے ہیں۔ ڈانٹے (Dante) بیان کرتا ہے کہ جیسے جیسے وہ جنت کے بلند سے بلند تر مقامات پر چڑھتا گیا۔ اس کی محبوبہ کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا گیا جسے دیکھ کر ڈانٹے کی بصیرت تیز ہوتی گئی اور عشق قوی ہوتا گیا۔ یہی خیال ابن العربی کی نظم میں بھی موجود ہے جو انہوں نے ڈانٹے سے تقریباً ایک صدی قبل ترجمان الاشواق (نمبر ۲۰) میں لکھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ "محبوب کی ملاقات سے مجھ میں وہ باتیں پیدا ہو گئیں جو میرے وہم میں بھی نہ آتی تھیں۔ کیونکہ میں نے ایسی صورت دیکھی جس کا حسن و جمال ہر ملاقات کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ایسے عشق سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ جو محبوب کی حسن افزائی کے ساتھ برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہو" یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن العربی کی بھی ایک محبوبہ تھی۔ جو مکین الدین کی حسین اور شائستہ بیٹی تھی اور نظام کے نام سے موسوم تھی۔ اس کے عشق میں انہوں نے جو صوفیانہ غزلیں کہی تھیں ان کا جب چرچا شروع ہوا اور ان سے بدنامی ہونے لگی تب انہوں نے ان غزلیات پر ایک شرح لکھی تاکہ معترضین کو یقین ہو جائے کہ وہ لوگ غلطی پر تھے۔ اسی طرح ڈانٹے نے بھی کانوتو (Convito) میں ان اسرار باطنی کی طرح لکھنے کا قصد ظاہر کیا ہے جو اسکے چودہ عشقیہ گیتوں کی تہ میں مخفی ہیں۔ ان گیتوں کو اس نے کسی قبل کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ اور ان کے مضامین سے یہ غلط خیال پھیل گیا تھا۔ کہ یہ اشعار خالص اور پاک محبت سے نہیں بلکہ شہوانی محبت سے متعلق ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ان دونوں میں کلی اور جزوی مماثلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ صرف ایک ہی نتیجہ پر آنا ممکن ہے۔ اسلامی خصوصیات مثلاً معراج اور حیات بعد الممات کا عام اور فلسفیانہ تخیل مسلمان محدثین اور فارابی۔ بوعلی سینا غزالی اور ابن عربی جیسے مصنفین کے ذریعہ مشترکہ علمی ذخیروں میں داخل ہو کر تیرھویں صدی عیسوی کے

بہترین دماغوں تک یقیناً پہنچا ہوگا۔ اسپین اور سسلی کے عرب فاتحوں نے وہی فیضان مفتوحین پر کیا جو ایران اور شام کے یونانی تمدن سے خود انہوں نے حاصل کیا تھا۔ گو مفتوحین پر اس فیضان کا اثر نسبتاً کمزوری ہی کے ساتھ کیوں نہ پڑا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں اس قبولیت تاثرات کی بین شہادت کا ملنا اگر بیشتر دشوار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے جب دو قومیں روزمرہ کی زندگی میں باہم مل جل کر رہتی ہیں اور یہ میل جول طویل مدت تک قائم رہتا ہے۔ تو دونوں قوموں کی ذہنیت کا باہم ایک دوسرے سے متاثر ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس کا تفصیلی ذکر تحریروں میں محفوظ رہ سکے۔

آداب مشرق پر بھی نگاہ ڈالیں جہاں ایرانی تصوف کا عہد زرین شروع ہو چکا تھا جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے اسی طرح وحشی مغلوں کے ایشیا پر سیلاب سے تباہی، بربادی، بدحواسی مصیبت اور بدنظمی کا جب دور ختم ہوا تو تصوف میں چمک پیدا ہوئی۔ افراد کی طرح اقوام بھی مصائب طویلہ کے بعد تسکین حالت کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ایران بھی بوجہ اسکے کہ کثرت تکان سے اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اپنی ہمسایش وراحت کے لئے ان لوگوں کی جانب مائل ہو گیا جو ایک طرف تو ان چیزوں کو پیش کر رہے تھے۔ جو اپنے فقدان کے باعث زیادہ قیمتی ہو گئی تھیں۔ مثلاً حسن انتظام، امن، انصاف، امور منفعت عامہ، تمدن خوبیاں، اور وہ مراسم وروایات جن پر قومی تنظیم کا دارومدار ہے۔ اور دوسری طرف سلامتی و مسرت ابدی کے وہ صوفیانہ نقشے پیش کر رہے تھے۔ جو ان اہل صفا ہی کو میسر آسکتے ہیں۔ جن کے نزدیک عالم ارواح ہی حقیقی اور دائمی چیز ہے۔ ان نقشوں کا کھینچنا صوفی شعرا ہی کا کام تھا۔ اور جس خوبی سے انہوں نے اس کام کو انجام دیا۔ اس نے تصوف کی فارسی شاعری کو ان ممالک میں بھی مشہور کر دیا۔ جن میں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے۔

ان نقشوں کی عقلی بنیاد ابن العربی نے مہیا کی۔ ہم دیکھیں گے کہ ان کے اثر کی بدولت تصوف کو قلب و ضمیر سے اتنا تعلق نہ رہا جتنا کہ پرواز عقلی اور فلسفۂ ظنی سے اس کا تعلق ہو گیا۔ اور یہ بات صوفیاء متقدمین کے اخلاقی اور مذہبی جذبات سے بیگانہ ہے۔ اب مستند ولی وہ نہیں رہا۔ جس نے خدا کو دعاؤں اور مناجاتوں سے طلب کیا ہو اور ریاضت شدید کے بعد فنائیت کا جام پی کر محض ناقابل اظہار فضل ربی سے اسے پایا ہو بلکہ اب مستند ولی وہ ہے جو عارف کامل ہو واقف رموز خفی و جلی ہو۔ انسان کامل ہو، خدا سے غیبت رکھتا ہو یا اس کا "امر کن" ہو اور یہ کہتا ہو کہ ؎

من آن روز بودم کہ اسماء نبود — نشان از وجودِ مسمّٰی نہ بود

زمین گشت، اسم و مسمّٰی پدید — در آں روز کا نجا من و ما نبود

اس نوعیت کی شاعری کی خصوصیات پر غور کرنے سے قبل اس فلسفیانہ نظریہ کو بیان کر دینا مناسب ہے جو کہ اس کی بنیاد ہے۔

صرف ذات خدا ہی کا وجود ہے۔ اس کی صفات اُس سے اعتباری غیریت رکھتی ہیں مگر حقیقتاً اس سے جدا نہیں۔ صفات الٰہی کے مجموعہ کو ہم کائنات کہتے ہیں۔ اور کائنات متغیر ہوتی رہتی ہے۔ اور اس میں اللہ اپنا اظہار فرماتا ہے۔ کائنات کو بقدر اس ظہور ہی کے حقیقت میں حصہ ہے۔ جو چیزیں کہ نظر آتی ہیں اپنا ذاتی وجود نہیں رکھتیں بلکہ ذات مطلق کے پرتو کی وجہ سے وجود اعتباری اختیار کر لیتی ہیں۔ نظام عالم میں مرتبۂ انسانی کے متعلق اوپر تفصیل کی گئی ہے۔ عالم ارواح اور عالم اجسام کا اس میں اجتماع ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے اور کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ سمت ظہور کی جانب اس کے ظلمتِ عدمی ہے۔ چونکہ تقید جسمانی نے اسے گرفتار کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا سے جدا سمجھتا ہے۔ یہ نظری مغالطہ گو فہم و براہین کے

مطابق ہے مگر فلسفۂ تصوف کے اس پہلے اصول کے خلاف ہے کہ جملہ ہستی اور جملہ افعال قدرت الٰہی کا مظہر ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف صوفیائے اہل کشف کو ہو سکتا ہے اور وہ اسے دوسروں تک اپنے ہی اشارات و اصلاحات کی مدد سے پہنچا سکتے ہیں جس عشقیہ شاعری میں ان باتوں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے وہ ان امور کو جن تک عقل کی رسائی نہیں نہایت خوبی سے ذہن نشین کر دیا کرتی ہے۔ علاوہ بریں جذبات عشق کو ان کیفیات و احوال صوفیا سے بہت مشابہت ہے۔ جو معرفت و ولایت سے متعلق ہیں۔ دور ماقبل میں ان کیفیات کو پیدا کرنے کے لئے تلاوت قرآن سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر بہت جلد یہ کام ان عشقیہ نظموں سے لیا جانے لگا۔ جنہیں ابتدا میں تصوف سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ کبھی مرزا میر کے ساتھ اور کبھی بلا مرزا میر اس نوع کی غزلیں حال پیدا کرنے کے لئے بکثرت گائی جانے لگیں۔ بعض صورتوں میں غزلیں اس مقصد کے لئے تصنیف بھی کی جاتیں ان شعراء کا منشا صرف یہی نہیں ہوتا کہ اپنے کلام میں حقائق کا اظہار کریں بلکہ اپنی شاعری کے ذریعہ سے وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ ایک ایسا حسین و جمیل تخیل پیش کریں۔ جو لامحدود اور ناقابل اظہار حقیقت کی جانب رہنمائی کرے۔ اور روح میں عالم بالا سے ایک مناسبت پیدا کر کے اسے انتہائی انکشافات روحانی کے لئے تیار کرے۔ مندرجہ مثالوں میں سے پہلی مثال ابن الفارض کے عربی دیوان سے لی گئی ہے اور دوسری مثال جلال الدین رومی کی فارسی غزل کا ایک حصہ ہے۔

(۱) میں ہی اپنے محبوب کے ساتھ تنہا تھا۔ جبکہ ہم دونوں میں خاص راز و نیاز جاری تھے میری مرضی کے مطابق مجھ پر تجلیات خاص ہوتی تھیں اور مجھ کو نوازا جاتا تھا۔ شہرت لامحدود میں گم تھا اس کے حسن اور اس کی شان کے درمیان مسرت خاموش کے ساتھ میں متحیر کھڑا رہتا تھا۔ میری روح پر کیفیات کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اسکے

رخ زیبا میں جملہ دلفریبیاں اور ادائیں مجتمع تھیں۔ اور کامل حسن و جمال جھلک رہا تھا۔ جسے دیکھ کر میں پکار اٹھتا تھا۔ کہ لا الہ الا ہو العلی العظیم (ابن الفارض)

(۲) آقا سے پوچھو یہ کونسا مکان ہے جس میں سے مسلسل مست نغموں کی آواز آرہی ہے۔ اگر یہ کعبہ ہے تو اس صورت بت کے کیا معنی؟ اور اگر یہ عبادت گاہ مجوس ہے تو اس نور الٰہی کے کیا معنی؟ اس مکان میں ایک ایسا خزانہ ہے جو اس تنگ کائنات میں سما نہیں سکتا۔ یہ مکان اور یہ آقا نظر فریبی کر رہے ہیں۔ اس مکان کو ہاتھ نہ لگانا کیونکہ یہ ایک طلسم ہے آقا سے بات نہ کرنا کیونکہ وہ مست ہے اس مکان کا کوڑا کرکٹ مشک و عطریات ہیں، اس کی چھت اور اس کے دروازے اشعار اور نغمے ہیں جسے اس مکان میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا وہ سلطان جہاں اور سلیمان وقت ہے۔

اے آقا! اس کی چھت سے اپنا سر ایک بار نیچا کر کیونکہ تیرا چہرہ نصیبہ وری کی علامت ہے مثل آئینہ کے تیری صورت میری روح میں اتر آئی۔ تیری زلفوں کی نوکیں میرے دل میں مثل شانہ کے چبھ گئی ہیں۔ یہ آقا مثل زہرہ اور قمر کے ہے اور آسمانوں کا مالک ہے یہ مکان عشق کا مکان ہے جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا

(مولانا رومی)

یہ غزلیات زمان اور مکان کی حدود سے تجاوز کر کے مستی کی وہ بلندی اختیار کرتی ہیں۔ جہاں سے ہر چیز پر ایک مجموعی نظر پڑتی ہے۔

فارسی شاعری کی دوسری قسم افسانہ ہائے عشق کی حکایات سے متعلق ہے۔ اس نوع کی شاعری کو نظامی (۱۲۳۰ء) نے کمال پر پہنچایا۔ اس کے ذریعہ سے اس درد و فراق کا نقشہ

خوب کھینچا جا سکتا ہے۔ جو سلوک الی اللہ میں روح پر گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکثرت پرانی کہانیاں مثل لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا کے صوفیانہ رنگ میں بیان کی گئیں۔

تیسری قسم ان کثیر التعداد نظموں کی ہے جن کی غایت محض تعلیمی ہے۔ ان کی ابتدائی صورت صرف منظوم ہدایات و نصائح ہیں جن کو مختصر کہانیوں اور واقعات سے مشرح کر دیا گیا ہے مثلاً حدیقۃ الحقائق جسے سنائی غزنوی نے لکھا ہے۔ یا پھر وہ نظمیں ہیں جن میں مقامات سلوک کا ذکر تشبیہ و استعارات کی مدد سے کیا گیا ہے ان دونوں اقسام کی شاعری نے نہایت تیزی کے ساتھ انتہائی ترقی حاصل کی۔ اول الذکر شاعری کی ترقی یافتہ صورت مثنوی جلال الدین رومی ہے اور موخر الذکر شاعری کی ترقی یافتہ صورت فریدالدین عطار کی منطق الطیر ہے۔ اس نظم میں ان طیور کا قصہ ہے جو ہدہد کی رہنمائی میں سیمرغ یعنی اپنے پراسرار بادشاہ کی تلاش میں نکلے۔ ان طیور نے اپنی طلب میں سات وادیاں طے کیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) طلب (۲) عشق۔ (۳) معرفت (۴) استغنا (۵) توحید۔ (۶) حیرت (۷) فقر و غنا۔

ان وادیوں کے طے کرنے کے بعد تیس طیور جو بچ رہے تھے جب پیش ہوئے تو ان پر منکشف ہوا۔ کہ وہ خود ہی سیمرغ ہیں اور سیمرغ کوئی چیز نہیں مگر وہی تیس پرند ؎

کشف ایں سر نو ے در خواستند — حال ما ئی و منی در خواستند

بے زبان آمد از آنحضرت خطاب — کے بود ایں ذرہ چوں آن آفتاب

ہر کہ آید خویش را بیند درو — جان و تن ہم پیش را بیند درو (عطار)

شاعر کا منشا غالباً جیلی کے اس دلچسپ مقولے سے سمجھ میں آجائیگا۔ جس میں انہوں نے عیسائیوں پر اعتراض کیا ہے کہ ان لوگوں نے ظہور الٰہی کو صرف مسیح میں محدود کر دیا۔ خدا فرماتا ہے کہ میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اور یہاں آدم سے مراد بنی نوع انسان کا ہر فرد ہے۔ جو لوگ خدا کو انسان کے آئینہ

ہیں دیکھتے ہیں ان کو معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے۔ اس عرفان کا ایک جزو ہی عیسائیوں کے ہاتھ آیا ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کا عقیدہ آخر کار ان کی اس وقت رہنمائی کرے گا۔ جب کہ اصل چیز اپنی اصلیت میں ان پر منکشف ہوگی اور جب انہیں یہ انکشاف ہوگا کہ انسان مثل آئینوں کے ہیں۔ جو آمنے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر آئینہ میں وہ نظر آتا ہے۔ جو سب آئینوں میں ہے۔ لہٰذا وہ خدا کو اپنے میں دیکھیں گے اور اقرار کرینگے کہ خدا ایک ہے۔"

کیوف قواعد کے پابند نہیں اس لئے عارف مذہب اور لامذہبی سے برتر ہے۔" مگر متبذل قسم کے صوفیوں کو مستثنیٰ رکھ کر اوروں کے نزدیک اسکے یہ معنی نہیں کہ لامذہبی اور بداخلاقی کی اس مقولہ سے انہیں اجازت مل گئی ہو۔ ولی صادق شریعت کی پابندی کرتا ہے۔ نہ بوجہ اسکے کہ وہ اسکے مجبور ہے بلکہ بوجہ اسکے کہ وہ اپنے آپ کو خدا سے واصل محسوس کرتا ہے۔ تکمیل الیت میں دونوں چیزیں شامل ہیں۔ ظہور بھی اور بطون بھی، وحدت بھی اور کثرت بھی، حقیقت بھی اور شریعت بھی خلق سے علیحدگی کافی نہیں تاوقتیکہ خالق کی ہدایت میں داخل ہو کر مخلوق میں خالق کے ظہور کا بھی ساتھ نہ دیا جائے۔ فنا سے گزر کر بقا میں پہنچنا انسان کامل کی علامت ہے۔ ایسا شخص سیر الی اللہ ہی پر بس نہیں کرتا سیر فی اللہ اور سیر مع اللہ میں مصروف ہوتا ہے۔ یعنی واصل باللہ ہونے کے بعد وہ خدا کے ساتھ عالم شہادت کی جانب لوٹتا ہے، اپنی ہدایت کی جانب رجوع ہوتا ہے۔ اور کثرت میں وحدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس نزول میں شریعت اس کا لباس ظاہری اور طریقت اس کی روش باطنی ہوتی ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو حقیقت کی تعلیم دیتا ہے اور خود شریعت پر پوری طرح کاربند رہتا ہے ؎

شریعت را شعار خویش سازد　　طریقت را دثار خویش سازد

قطع نظر امور نظر کے مسلمانوں میں اکابر اولیاء جنمیں سے بکثرت رہنمائے خلق تھے خوب سمجھتے تھے

کہ جس نے ادنیٰ امور پر دست رس حاصل نہ کی ہو اس پر اعلیٰ امور کا اظہار دراصل ان اعلیٰ امور کی تضیع ہے۔ سینٹ پال کی طرح وہ اس امتیاز کو مدنظر رکھتے تھے کہ "ایک گروہ کی پرورش کے لئے دودھ کی ضرورت ہے اور دوسرے گروہ کی پرورش کے لئے قوی گوشت کی" اس "دہری صداقت" کا اصول انہیں اس قابل بنا دیتا ہے۔ کہ وہ اللہ کے متعلق قرآنی تخیل کی یونانی ہمہ اوست (Pantheistic Philosophy) سے تطبیق دیکھیں اور اخلاقیات کا اتنا بلند معیار پیش کر دیں جس کا انتہائی اصول یہ ہو کہ شر محض کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

ایرانی تصوف کا لب لباب عام فہم پیرایہ میں مثنوی معنوی مولانا جلال الدین رومی میں درج ہے مولانا درویشوں کے سلسلہ مولویہ کے بانی ہیں۔ آپ کا انتقال قونیہ میں ۱۲۷۳ء میں ہوا۔ اس مثنوی کو "فارسی کا قرآن" کہا گیا ہے۔ اور اس کے مصنف کا دعوے ہے کہ اس میں تعلیم پیغمبر کا مغز بیان کر دیا گیا ہے۔ جو شخص سرسری طور پر اس تصنیف کی ادھر ادھر سے ورق گردانی کرے گا۔ وہ دیکھیگا کہ اس کی تعلیمات میں جا بجا حکایات، واقعات، افسانے، کہانیاں اور روایات جو شامل کی گئی ہیں۔ وہ زمانہ وسطیٰ کے مذہبی خیالات اور مذہبی زندگی پر محیط ہیں۔ غزلیات میں تو مولانا کی صوفیانہ نگاہ سوائے خدا کے کسی اور چیز پر نہیں جاتی مگر مثنوی میں انہوں نے ایک ایسے بلیغ اور پرجوش معلم کی شان اختیار کی ہے۔ جو ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہو جنہوں نے خدا تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ساری تعلیم کا نچوڑ افتتاحی اشعار میں دے دیا گیا ہے جس میں نے کو جو مولویہ سلسلہ کے درویشوں کا مقدس باجہ ہے۔ روح کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس روح پر خدا سے فراق کا مسلط ہو جانا بیان کیا گیا ہے۔ ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند — وز جدائیہا شکایت میکند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　باز جوید روزگار وصل خویش

اس نظم کے متعلق خوب بات کہی گئی ہے کہ "مذہبی تخیل کو عشق کی رنگینی سے رنگین اور پاکیزہ بنانے کی یہ ایک کوشش ہے۔" بقول جلال الدین کے وہ مذہب جو دلائل پر مبنی ہو اور ثبوت عقلی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ہو اتنا ہی بیکار ہے۔ جتنا کہ وہ مذہب جو رسم و رواج اور قدامت پرستی پر مبنی ہو۔ "متبرک راز دان جانتا ہے اور ثبوت کا محتاج نہیں شیطان کی جانب سے منطق ہے اور آدم کی جانب سے عشق۔"

خدا کی نگاہ میں ہمیات اور فرقہ بندیوں کی کوئی وقعت نہیں۔ خدا نہ مسجد میں رہتا ہے نہ گرجا میں، نہ مندر میں، وہ پاک اور ستھرے دل میں رہتا ہے۔ اصل چیز پوری اخلاقی کایا پلٹ ہے جو ایمان کامل اور عاجزانہ دعاؤں سے حاصل ہوتی ہے۔ جلال الدین کو خدا کی اچھائی اور انسان کی گنہگاری کا پورا یقین ہے۔ اس لئے وہ خالق کی طرف شر کی اضافت کے قائل نہیں۔ بلکہ مخلوق کی طرف اس کی اضافت کے قائل ہیں۔ خدا کا اپنے کمال کو ظاہر کرنا خوبی ہے جس طرح کہ ایک مصور خوشنما اور بدنما دونوں چیزوں کی تصویر کھینچنے میں اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے۔ نہ کہ اپنی بدنمائی کا۔ مگر مثنوی نے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے۔ کہ جملہ اشیاء میں جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہیں۔ ایک ربط باہمی اور تناسب موجود ہے۔ جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ ہر انفرادی شر منفعت عامہ کے حق میں خیر ہے۔ تاہم اس ایرانی صوفی نے خودی کے خلاف مرتے دم تک جنگ جاری رکھنے پر بہت زور دیا ہے۔ خودی کو "سات دروازے والی دوزخ" اور تمام بتوں کی ماں" قرار دیا ہے۔ جو عیب لوگوں کو دوسروں میں نظر آتا ہے۔ وہ دراصل اُن ہی کے عیوب کا پرتو ہے۔ جو خرابیاں تم دوسروں میں دیکھتے ہو وہ سب تم ہی میں ہیں۔ جو ضرب تم دوسروں

پر لگاتے ہو وہ تم ہی کو لگتی ہے تمہیں اپنے عیوب صاف نظر نہیں آتے ورنہ تم اپنے سے پوری نفرت کرتے۔"

اس شاعر نے شہوت اور بدکرداریوں کے متعلق اس خوبی، اس وقت اور اس صداقت سے اس نظم میں طول طویل کلام کیا ہے۔ کہ بعض اوقات مترجم کو اس کا ترجمہ کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ جبریوں کے مقابلے میں وہ زور دیتے ہیں کہ ہمارے افعال اگرچہ خدائی قوتوں کا نتیجہ ہیں تاہم ہمارے ہی اختیار سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم خدا کو ان کا ذمہ دار قرار دیں اگر گنہگاروں کو ارتکاب گناہ میں اپنی مجبوری کا احساس ہے تو وہ اس جبر کے تحت میں اتنی مستعدی کے ساتھ کیوں آجاتے ہیں۔ اور بعد میں وہ شرمندہ کیوں ہوتے ہیں۔ اور اپنے خطا کار ہونے کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ مگر یہ اس مسئلہ کا قطعی اور آخری حل نہیں۔ کمال عشق کے بغیر اور ارادۂ انسانی کو ارادہ ہی کے تحت میں لائے بغیر کمال آزادی محال ہے۔

لفظ جبرم عشق را بے صبر کرد — آنکہ عاشق نیست حبس جبر کرد

ایں معیت با من است این جبر نیست — ایں تجلی مہ است ایں ابر نیست

گر بود ایں جبر، جبر عام نیست — جبر آں امارۂ خود کام نیست

جو اخلاقی رنگ مثنوی پر غالب ہے وہ مثنوی کے ان فلسفیانہ حصوں میں بھی پایا جاتا ہے جن میں ہستی واحد کا حیات کے مختلف طبقات میں ظہور فرمانا بیان کیا گیا ہے۔ اس ظہور کا خلاصہ روح کا وہ ارتقا ہے جس میں عقل کل کا تنزل عالم مادہ میں ہوا اور معدنیات، نباتات، حیوانات میں سے گزر کر عقل انسانی میں اظہار ہوا۔ پھر امتحانات ہوئے۔ سزائیں ملیں۔ عالم ملکوت میں عروج ہوا اور روحانی نشو و نما ہوتے ہوتے اس اطلاق میں وصل ہوا جس کا وہ آئینہ ہے اور یہ کھل گیا۔ کہ احساس فراق صرف ایک خواب تھا ؎

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — وز جمادی اندر نباتی اوفتاد

سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد

وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد

جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں — خاص در وقت بہار و ضمیراں

ہمچو میل کودکاں با مادراں — سر میل خود نداند در میاں

ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و رفت

عقل ہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحول کردنی ست

تا دہد زیں عقل پر حرص و طلب — صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد زپیش — کے گذارندش در آں نسیان خویش

باز آزاں خوابش بہ بیداری کشند — کے کند ہر حالت خود ریش خند

گنجایش نہیں کہ اس عظیم الشان اور ہمہ گیر کتاب منظوم کے زائد اقتباسات یہاں درج کئے جائیں۔ ایرانی تصوف کا اصلی رنگ اس خوبی اور قوت کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ اس کی کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی اگو بوجہ اس کتاب کے عالمانہ رنگ، طوالت، اور اشکال پسندی کے اول سے آخر تک بالالتزام کم لوگ اُسے پڑھتے ہیں۔ اس کے مصنف کو دنیا سے جدید کی جھلک بھی حاصل ہوئی ہے۔ اور غزالی کے مقابلہ میں وسیع الخیالی بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیونکہ غزالی کا مذہبی رنگ زمانہ وسطیٰ کے روشن خیال علماء کے مذہبی رنگ سے ملتا جلتا ہے۔ صوفی کی فطرت میں ایک پرواز ہوتی ہے۔ اور فقیہہ کا کام اس بڑھیا کی نقالی ہے۔ جس نے شاہی باز کے ہاتھ آجانے پر اس کے پر اور پنجے تراش دیئے تھے۔ اسلام میں اس نوعیت کی سزائیں دینا مشکل ہے۔ صوفیوں نے اسلام میں مقید رہ کر اس معاملہ میں جائز حد تک ترقی کی۔ صوفیوں

کی اس ترقی سے جو آزادی حاصل ہوئی وہ بالآخر فریقین کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ فریقین کے اصل جھگڑوں میں اس نے مصنفانہ روش اختیار کی اور باہمی رواداری کو ترقی دی۔ بعض رومن کیتھولک مصنفین اس آزادی کی طرف جن امراض کو منسوب کرتے ہیں۔ وہ امراض کم از کم ان معالجات سے کسی طرح بدتر نہیں جو یورپ کی مذہبی حکومتیں ایام گذشتہ میں کام میں لا چکی ہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں صوفیوں نے بھی اپنی تعلیمات کے بعض اندیشہ ناک نتائج سے محفوظ رہنے کے لئے رفتہ رفتہ ایک ایسی تنظیم قائم کر لی جس کے تحت میں کاملین کے اشارات کی تعمیل ماتحتوں پر لازمی قرار پا گئی۔ اس تنظیم نے ایک مذہبی حکومت کی صورت اختیار کر لی جس کے اراکین پوشیدہ اور ظاہر اولیا رہوتے ہیں۔ اور ایک قطب ان کا افسر اعلےٰ ہے۔ صوفیوں کے عقیدہ کی رو سے دنیا کی روحانی حکومت اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ اس جماعت کی ذمہ داری اس بنا پر اور بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ کہ عملاً ہر صوفی کی تعلیم ایک شیخ کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس شخص نے اپنی تعلیم آپ ہی کی ہو وہ اس سلسلہ سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ مگر نگران کا نگران کون ہو؟ اولیاء کی خوبیوں سے مجھے بحث نہیں۔ مگر رسمی یا خود ساختہ قوانین اخلاق یا اس دنیا کی کسی اور چیز کا ایسے لوگوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ جو جو اپنے اوپر آپ ہی اثر ڈالنے کے طریقوں (Auto Hypnotic Methods) سے اپنی کیفیات کو بڑھاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اس حد تک الہام رسیدہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اپنی شخصیت کو خدا میں گم تصور کرنے لگتے ہیں۔ بجائے اسکے کہ ان لوگوں کو معمولی معیار سے جانچا جائے۔ جو کہ ایک فضول بات ہے آؤ ہم غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر آئیں کہ اپنے نصب العین میں یا جیسا کہ وہ کہتے ہیں حقیقت میں ان کا سچا انہماک گناہوں کے انبوہ کثیر کو ڈھانپ لیتا ہے اور آؤ ہم اس بات کو بھی تسلیم کر لیں۔ کہ اپنی تلاش میں اگرچہ وہ مقصود تک نہیں پہنچے۔

تاہم جو کچھ اسلام انہیں دے سکتا تھا اس سے پاکیزہ تر مذہب اور اعلےٰ تر اخلاق تک
بہر نوع ان کی رسائی ہو گئی۔ [1]

آر۔ اے۔ نکلسن۔

---

[1] افسوس ہے کہ پروفیسر نکلسن نے اس مضمون میں نہ اسلام کے متعلق اپنی صحیح معلومات کا ثبوت دیا تصوف کے متعلق جو شخص ان دونوں چیزوں سے پوری طرح واقف نہ ہو اس کی رائے ان کے تعلق باہمی کی بابت معتبر نہیں۔ امور مذہبی میں سطحیات پر فلسفیانہ نگاہ ڈال کر غنیات میں الجھنا اور قیاس نتائج پر آکر ٹھوکریں کھانا محققانہ شان سے بعید ہے۔ ایک زمانہ جب کہ یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ مسمرزم اور ہپناٹزم پر اعتبار نہ کرتے تھے۔ کیونکہ یہ چیزیں ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اب تک یورپ میں جماعت کثیر ان چیزوں کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ صرف ایک جماعت قلیل ہے۔ جو ان سے کسی قدر شغف رکھنے لگی ہے۔ مگر اب تماشا یہ ہے۔ کہ وحی والہام کے متعلق ہر وہ بات جو اہل یورپ یا ان کے شاگرد دل کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مسمرزم یا ہپناٹزم یا ہپناٹزم کی کوئی قسم قرار دے دی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ قرار دہندہ مسمرزم کے مانے اور سمجھنے والے ہوں یا نہ ہوں۔ ان لوگوں کے نزدیک وحی الٰہی بھی نعوذ باللہ سیلف ہپناٹزم ہے اور صوفیائے کرام کے احوال و وجدانات بھی وہی نوعیت رکھتے ہیں۔ لیکن ایک فلسفی جو اپنے کمرہ میں بند ہو کر اپنے تخیلات میں گم ہو جاتا ہے۔ اور دور کی کوڑی لانا شروع کر دیتا ہے۔ یا ایک سائنس داں موجد جو اپنی لیبوریٹری (Laboratory) میں مقید ہو کر دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جاتا ہے۔ اور اپنی کسی ایجاد مطلوبہ کی دھن میں مستغرق رہتا ہے۔ وہ اپنے نقاب تخیل کے کسی در میں جا کر بھی سیلف ہپناٹزم ہیں ہوتا ایام جاہلیت کے جاہل و منکر عرب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے پر آپکے جن کمالات پر جادو کا گمان کرتے تھے ان ہی کمالات پر اب اہل یورپ ہپناٹزم کا گمان کرتے ہیں۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ ذہنیت میں کوئی فرق نہیں +

سلسلۂ مطبوعات اقبال اکیڈمی

ہمارے ہندوستانی مسلمان - از ولیم ہنٹر، آئی سی ایس	عہ ۱۲/
اقبال پر ایک نظر - مرتبہ سید محمد شاہ ایم - اے	عہ ۱۲/
تعلیمات اقبال - پروفیسر سلیم چشتی - بی - اے	عہ ۸/
شرح اسرار خودی - " "	عہ ۸/
اقبال اور پیام حیات - " "	عہ ۸/
اسلامی پارٹی کا آئین - از مولانا عزیز ہندی	۴/
ہیگل کا فلسفہ -	
اقبال کا تصور زمان و مکان - از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی	۱۰/
موت و حیات اقبال کے کلام میں - " "	۶/
تعلیم کا مسئلہ " "	عہ ۸/
اقبال کے چند جواہر ریزے - از خواجہ عبدالحمید ایم - اے	۱۰/
اشتراکیت اور اسلام - از مولوی محمد مظہر الدین صدیقی - بی - اے	۶/
محمد عبدہ - از چارلس ایڈمز مترجمہ " "	عہ ۸/
علمائے کرام کا مستقبل - از مولوی محمد مظہر الدین صدیقی بی اے	۸/
حقیقت نفاق - از مولانا صدر الدین اصلاحی	عہ ۸/
افادات حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی - از مولانا صدر الدین اصلاحی	عہ ۸/
معرکۂ اسلام و جاہلیت " "	عہ ۸/
دربار رسول کے فیصلے مترجمہ ابو العرفان حکیم محمد عبدالرشید	عہ ۸/
اقبال کا تصور خودی از ڈاکٹر سید عابد حسین - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی	عہ ۸/
المنبہات (عربی) از حافظ ابن الحجر العسقلانی	عہ ۸/
القول الجمیل (") از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	عہ ۸/
سیدہ فاطمہ رض	عہ ۸/
ابو جعفر منصور	عہ ۸/
یاد اقبال	عہ ۸/
کتب سماوی پر ایک نظر	عہ ۸/
کالا پانی	عہ ۶/
ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر	عہ ۴/
نبوت محمدی کا عقلی ثبوت	عہ ۸/
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	عہ ۸/
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	عہ ۸/

اقبال اکیڈمی

۵۴ (الف) سرمکلر روڈ بیرون موچی دروازہ لاہور